افکارِ حقیقت

قیام پاکستان کے تناظر میں



نتیجۂ فکر

سید کلبِ ارتضیٰ نقوی

بسم الله الرحمن الرحيم

افکارِ حقیقت

قیام پاکستان کے تناظر میں

نتیجۂ قلم

سید کلبِ ارتضیٰ نقوی

نام کتاب.........افکارِ حقیقت۔ قیام پاکستان کے تناظر میں

مصنف........سید کلب ارتضٰی نقوی

طبع...............اول

کمپوزنگ.........قائم گرافکس۔ جامعہ علیہ۔ ڈیفنس۔ کراچی 03452401125

سال اشاعت...... دسمبر ۲۰۰۷ء

ہدیہ................دو سو روپے

ملنے کا پتہ

۱۴۲/۱۔اسٹریٹ ۱۳۔خیابان بخاری

فیز ۶ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۷۵۵۰۰

ٹیلی فون: ۰۲۱۔۵۳۴۶۶۳۸

انتساب

والد محترم جناب سید کلب جعفر صاحب قبلہ

اور

والدہ ماجدہ سیدہ سجادی بیگم صاحبہ

کے نام

جن کی شفقت و محبت اور سایۂ عاطفت سے محرومی
آج بھی میرے قلب کو بر مارہی ہے۔

سید کلب ارتضیٰ نقوی

والد ماجد کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہوا اس وقت میری عمر کم وبیش آٹھ سال تھی اور والدہ ماجدہ کی وفات مئی ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ خداوند عالم ان کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

فہرست

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

پدماوت کے مصنف، عہد شیر شاہی کے نامور شاعر ملک محمد جائسی کے وطن مالوف قصبہ جائس ضلع رائے بریلی (اتر پردیش) بھارت میں پانچ جولائی ۱۹۲۷ء کو میری ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم قصبہ ہی میں حاصل کی، میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول رائے بریلی سے، انٹر میڈیٹ (کامرس) لکھنؤ کرسچن کالج سے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔کام کے امتحانات پاس کئے۔ کالج اور یونیورسٹی کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتا رہتا تھا کالج کی کامرس یونین میں جوائنٹ سکریٹری کے عہدہ کے لئے الیکشن میں حصہ لیا۔ کامرس کے شعبہ میں صرف چند مسلم طلباء تعلیم حاصل کر رہے تھے باقی سارے غیر مسلم تھے۔ لیکن اپنے پہلے ہی سال میں نے ایسی مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ اپنے مدمقابل کو بھاری اکثریت سے شکست دے دی۔ کالج میں منعقد ہونے والے انگریزی اور اردو تقریری و تحریری مقابلوں میں انعامات حاصل کئے۔ مختلف موضوعات پر

مضامین تحریر کئے جن میں سے اکثر شائع ہوئے۔ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران بھی مضمون نگاری کا سلسلہ جاری رہا۔ سیاسی وسماجی سرگرمیوں سے متعلق جو مضامین تحریر کئے وہ زیادہ تر روزنامہ سرفراز لکھنؤ میں شائع ہوئے۔ میرے ایک مضمون کی تائید وتعریف میں مذکورہ اخبار نے ''قوم کے نوجوانوں کی جسمانی صحت۔ ایک معقول تجویز'' کے عنوان سے بطور خاص اداریہ شائع کیا۔ سیاست کے موضوع پر تحریر کردہ میرے ایک اور مضمون کا ذکر بھی اسی روزنامہ نے اپنے ایک اور اداریہ میں کیا۔ سرفراز اخبار کے علاوہ ہفت روزہ پیام اسلام (جو سید العلماء علامہ سید علی نقی نقوی اعلیٰ اللہ مقامہ کی سرپرستی میں شائع ہوتا تھا) اور روزنامہ رضا کار لاہور میں بھی میرے مضامین شائع ہوئے۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں منعقد ہونے والے بعض اردو تقریری مقابلوں میں بھی شرکت کی اور انعام حاصل کیا۔ جس کی وجہ سے شعبہ اردو کے اساتذہ شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں پٹنہ یونیورسٹی نے اپنی سلور جوبلی کے موقع پر کل ہند اردو تقریری مقابلہ کا اہتمام کیا۔ جامعہ لکھنؤ کو دعوت موصول ہوئی کہ دو طلباء کو اس تقریری مقابلے میں شرکت کے لئے نامزد کیا جائے۔ کامرس کا طالبعلم ہونے کے باوجود ایک میرا نام تجویز کیا گیا۔ ہندوستان کی بعض دیگر جامعات سے بھی طلباء نے شرکت کی لیکن ٹرافی لکھنؤ یونیورسٹی نے حاصل کی۔ اس تقریری مقابلے کی خبر ہندوستان کے مختلف اخبارات میں شائع ہوئی جس میں پٹنہ شہر کا انگریزی روزنامہ دی انڈین نیشن (Indian Nation) اور الہ آباد و

کلکتہ سے بیک وقت شائع ہونے والا انگریزی روزنامہ امرت بازار پتریکا (Amrit Bazar Patrika) خاص طور پر قابل ذکر ہیں مؤخر الذکر اخبار نے میری تصویر بھی شائع کی۔

بی۔کام (B.Com) کے امتحان میں کامیابی کے بعد میں نے ایم۔کام (M.Com) اور ایل ایل۔بی (L L.B) میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں ایل ایل۔بی۔کی تعلیم جامعہ لکھنؤ میں شام کے وقت ہوا کرتی تھی۔ سال اول کے دونوں امتحانات میں کامیابی حاصل کر کے سال دوم میں پہنچ گیا۔ اس وقت تحریک پاکستان اپنے پورے شباب پر تھی اس کے اثرات فطری طور پر میرے دل و دماغ پر بھی مرتب ہوئے یہاں تک کہ میں نے تعلیم کا سلسلہ ترک کر کے سیاست میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔ مسلم لیگ کی حمایت کے لئے ''شیعہ یوتھ لیگ'' کے نام سے شیعہ طالب علموں کی ایک جماعت کی داغ بیل ڈالی اور اسے بشمول جامعہ لکھنؤ متعدد کالجوں اور اسکولوں میں متعارف و منظم کیا۔

شیعہ یوتھ لیگ کے تمام عہدہ داروں کا انتخاب طلبہ تک محدود تھا البتہ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل یو۔پی۔(بھارت) کے ایک ممتاز مسلم لیگی لیڈر جناب نوازش علی قزلباش صاحب ایم۔ایل۔اے شیعہ یوتھ لیگ کے صدر کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ اس وقت عقیل رضوی صاحب شیعہ یوتھ لیگ کے جنرل سیکریٹری اور میں نائب صدر تھا۔ قیام پاکستان کے بعد قزلباش صاحب لاہور تشریف لے آئے اور چند برسوں بعد عالم جاودانی کو کوچ کر گئے۔

عقیل رضوی صاحب بھی پاکستان آ گئے اور حکومت پاکستان میں مختلف عہدوں پر فائز ہوتے رہے ریٹائرمنٹ کے وقت محکمہ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن ڈیپارٹمنٹ (Excise and Taxation Department) میں ڈائریکٹر انسپیکشن اینڈ ٹریننگ (Director Inspection and Training) کے عہدے پر فائز تھے۔ ریٹائرمنٹ کے چند سال بعد وہ بھی خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے......آمین

شیعہ یوتھ لیگ دسمبر ۱۹۴۵ء میں قائم ہوئی، اس وقت سے جون ۱۹۴۷ء تک میں جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ مسلم لیگ کی حمایت میں میرے بیانات ہندوستان کے اکثر اردو اور انگریزی اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ جن میں لکھنؤ سے شائع ہونے والے اخبارات، روزنامہ سرفراز، روزنامہ پانیر، روز نامہ تنویر، روزنامہ نیشنل ہرلڈ، روزنامہ حقیقت، روزنامہ ہمدم، روزنامہ قومی آواز، روزنامہ انجام اور دہلی سے شائع ہونے والے اخبارات روزنامہ ڈان، روزنامہ منشور قابل ذکر ہیں۔ میری سیاسی سرگرمیاں صرف بیانات جاری کرنے تک محدود نہ تھیں بلکہ مسلم لیگ اور شیعہ یوتھ لیگ کے جلسوں میں شرکت، کارنر میٹنگوں میں تقاریر، بعض مقامی کانگریسی مسلم لیڈروں سے تبادلہ خیالات، میری سرگرمیوں کا حصہ تھیں۔

شیعہ یوتھ لیگ کے قیام کا سبب یہ ہوا کہ تقسیم ہند سے قبل جب مرکزی اور صوبائی انتخابات کا اعلان ہوا تو لکھنؤ سے مرکزی اسمبلی کیلئے تین امیدوار

میدان میں اُتر آئے۔ مسلم لیگ کی جانب سے چوہدری خلیق الزمان صاحب امیدوار تھے، ایک امیدوار ''سنی بورڈ'' کی طرف سے تھا اور سید علی ظہیر صاحب آزاد امیدوار تھے جنہیں آل انڈیا کانگریس اور کانگریس نواز تمام شیعوں کی حمایت حاصل تھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر میں نے ضروری سمجھا کہ شیعہ طلباء کی ایک انجمن قائم کی جائے جو مسلم لیگ اور مسلم لیگی امیدوار چوہدری خلیق الزمان صاحب کی بھرپور حمایت کرے تاکہ مسلم لیگ کے حق میں شیعوں کے زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کئے جاسکیں۔

ملت جعفریہ کا متفقہ طور پر کوئی واضح سیاسی لائحہ عمل نہ تھا۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے نام سے ایک غیر سیاسی ادارہ شیعوں کے حقوق کا نگہبان تھا۔ آل انڈیا شیعہ پولیٹکل کانفرنس کے نام سے بھی ایک ادارہ قائم تھا لیکن وہ مستقل طور پر جمود کا شکار تھا۔ ان حالات کے پیش نظر میرے برادر بزرگ خان بہادر فخر قوم سید کلب عباس صاحب نے (جو آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے جنرل سیکریٹری تھے) آل پارٹیز شیعہ کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء لکھنؤ کے رفاہ عام ہال میں اس کا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت کے لئے بمبئی سے حسین بھائی لالجی کو مدعو کیا گیا۔ اس کانفرنس میں شیعوں کے مختلف اداروں اور نمایاں شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا تاکہ ایک متفقہ لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ شیعہ یوتھ لیگ کے نمائندہ کی حیثیت سے مجھے بھی اس اجلاس میں شریک ہونے کا موقع ملا۔

اس اجلاس میں مسلم لیگ کے حامی اور کانگریس کے ہمنوا مندوبین نے اپنے اپنے موقف کی حمایت میں پرزور تقریریں کیں لیکن اجلاس میں کانگریس نواز مندوبین کی ریشہ دوانی کی وجہ سے مسلم لیگ کے حق میں قرارداد پاس نہ ہوسکی۔

اس اجلاس میں جو ریزولیشن پاس ہوا وہ غیر متوقع نہ تھا حسین بھائی لالجی کو آل انڈیا کانگریس کی بھرپور حمایت حاصل تھی وہ مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ مرکزی اسمبلی کے الیکشن میں انہوں نے قائداعظمؒ کے خلاف انتخاب میں حصہ لیا۔ کانفرنس کے انعقاد کا انتظام کرنے والوں میں بھی اکثریت ان حضرات کی تھی جو آل انڈیا کانگریس کے ہمدرد تھے۔ اجلاس میں کانگریس کی حمایت میں قرارداد پاس ہونے کے بعد مسلم لیگی خیالات کے حامل مندوبین نے احتجاجاً واک آؤٹ کر دیا۔ واک آؤٹ کرنے والوں میں خود میں بھی شامل تھا۔

آل پارٹیز شیعہ کانفرنس کے اختتام کے کچھ دنوں کے بعد مجھے دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ دہلی جانے لگا تو مسلم لیگ کے زبردست حمایتی میرے بڑے بھائی سید کلب مصطفیٰ صاحب نے ہدایت کی کہ میں دہلی میں انگریزی روزنامہ ڈان کے ایڈیٹر سے مل کر آل پارٹیز شیعہ کانفرنس کی کاروائی کے بارے میں انہیں مفصل آگاہی دوں۔ دہلی پہنچنے کے چند روز بعد میں نے الطاف حسین صاحب سے ملاقات کی اور انہیں اپنا مکمل تعارف کراتے ہوئے

آل پارٹیز کانفرنس کے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کیا۔ موصوف نے میری گفتگو بغور سننے کے بعد مشورہ دیا کہ میں ڈان اخبار کو اپنا تفصیلی بیان بھیج دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ شیعہ یوتھ لیگ کے سیکریٹری کی حیثیت سے میرا بیان مورخہ تیس اکتوبر ۱۹۴۵ء کو شائع ہوا۔ جس کی سرخی تھی:

"Shias' Decision to Supprt League"

شیعہ یوتھ لیگ نے مسلم لیگ کی ہر ممکن مدد کی۔ لکھنؤ میں مرکزی اسمبلی کے امیدوار چوہدری خلیق الزمان کی حمایت میں جلسے، جلوسوں اور کارنر میٹنگوں کا اہتمام شیعہ یوتھ لیگ کی سرگرمیوں کا حصہ تھا ان ہی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ کے نامزد امیدوار چوہدری خلیق الزماں صاحب کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی جس کا اعتراف خود چوہدری صاحب نے ایک جلسہ میں کیا کہ شیعہ یوتھ لیگ نے ان کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

میں فیصلہ کر چکا تھا کہ قیام پاکستان کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر جاؤں گا لیکن سیاسی سرگرمیاں ختم ہوئیں تو خیال آیا کہ پاکستان جانے سے قبل اپنی نامکمل تعلیم کو مکمل کر لیا جائے چنانچہ ایم۔کام اور ایل ایل۔بی۔ کے دوسرے سال میں ازسرنو داخلہ لیا۔ مصمم ارادہ تھا کہ امتحانات کا نتیجہ نکلنے کے بعد جس قدر جلد ممکن ہوگا مستقل طور پر پاکستان چلا جاؤں گا لیکن اپنے اس ارادے کو نومبر ۱۹۴۸ء سے قبل عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ تاخیر کا سبب یہ ہوا کہ جب میں ایم۔کام کے آخری سال میں زیرِ تعلیم تھا تو بی۔کام اور ایم۔کام کے نصاب میں

ایک مضمون ایئر ٹرانسپورٹ (Air Transport) شامل تھا۔ فروری ۱۹۴۷ء کی بات ہے جب میں نے اس مضمون سے متعلق مقالات تحریر کر کے اپنے محترم پروفیسر ڈاکٹر ڈی۔ پنتھ صاحب کی خدمت میں برائے تنقید و اصلاح پیش کئے، جو کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ایئر ٹرانسپورٹ کا مضمون بھی پڑھاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مقالات مطالعہ فرما کر چند دنوں بعد واپس کئے تو تقریباً ہر مقالے پر تعریفی نوٹ تحریر فرمائے تھے اور آخر میں لکھا تھا:

"There is nothing to suggest. Your notes are excellent. Bring out a book on the subject."

چنانچہ امتحانات ختم ہونے کے بعد میں نے تمام تر توجہ مجوزہ کتاب پر مرکوز کر دی۔ بالآخر نومبر ۱۹۴۸ء میں کتاب مکمل ہو گئی طباعت کے لئے الہ آباد کے مشہور پبلشرز ''کتاب محل'' سے معاہدہ ہو جانے کے بعد میں سابقہ مشرقی پاکستان ہجرت کر گیا۔

میری کتاب "Air Transport in India" شائع ہوئی تو ہندوستان کے بعض انگریزی اخبارات اور جرائد نے حوصلہ افزا تبصرے شائع کئے اور ہندوستان کی ان تمام جامعات نے نصاب میں شامل کر لیا جہاں ایئر ٹرانسپورٹ کا مضمون پڑھایا جاتا تھا۔

سابقہ مشرقی پاکستان پہنچنے کے بعد کچھ دنوں ڈھاکہ میں قیام رہا اس کے بعد چٹاگانگ منتقل ہو گیا چند ماہ بعد اسٹیٹ بینک افیسرز اسکیم

(State Bank Officers' Scheme) کے تحت منتخب ہونے کے بعد مرکینٹائل بینک (Mercantile Bank) میں ٹریننگ کے لئے تعینات کردیا گیا۔ اس وقت بینک کے منیجر مسٹر ای۔ آر۔ ویسٹ (Mr.E.R.West) تھے۔ ٹریننگ کے دوران اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے متعلقہ تحریری امتحان میں کامیابی حاصل کی جس کی اطلاع مرکینٹائل بینک کو بھی مل چکی تھی۔ ٹریننگ کے دوران میری کارکردگی سے مسٹر ویسٹ اس قدر خوش اور مطمئن تھے کہ انہوں نے ازخود اپنے بینک میں ملازمت کے لئے میرا نام بینک کے صدر دفتر بھیج رکھا تھا۔ اس کا اظہار انہوں نے اس وقت کیا جب اسٹیٹ بینک سے انہیں میری کامیابی کی اطلاع ملی لیکن میں نے ان کی پیشکش قبول نہ کی۔

مسٹر ویسٹ کا کچھ دنوں کے بعد تبادلہ ہوگیا تو ان کی جگہ پر مسٹر جے۔ بی۔ پیرسن بحیثیت منیجر تعینات ہوئے۔ وہ بھی میری کارکردگی سے بہت خوش تھے انہیں مجھ پر اس قدر اعتماد تھا کہ جب ہندو مسلم فسادات کے دوران کئی ہندو ملازمین ملازمت چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے تو مسٹر پیرسن نے خواہش ظاہر کی کہ میں اپنے اعتماد کے افراد کو بینک میں ملازمت کے لئے منتخب کروں۔ چنانچہ میری سفارش پر تین افراد کو بینک میں ملازمت دے دی گئی۔

کچھ دنوں بعد نیشنل بینک آف پاکستان کی جانب سے کھلنا برانچ میں ملازمت کے احکامات موصول ہوئے چنانچہ مرکینٹائل بینک سے سبکدوشی حاصل کرنے کے بعد کھلنا پہنچ کر نیشنل بینک آف پاکستان میں ملازمت

اختیار کرلی۔تقریباً دس ماہ بعد میرا تبادلہ میمن سنگھ ہوگیا اور مئی ۱۹۵۳ء میں کراچی آگیا۔کراچی پہنچا تو نیشنل بینک کی طرف سے ہدایت ملی کہ کراچی میں واقع ایگری کلچرل ڈیویلپمنٹ فائنانس کارپوریشن (Agricultural Development and Finance Corporation) کے صدر دفتر جاکر رپورٹ کروں کیونکہ انہیں اپنے ریجنل آفس سکھر میں کچھ عرصے کے لئے ایک تجربہ کار اکاؤنٹینٹ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مجھے وہاں تین ماہ کے لئے تعینات کردیا گیا۔لیکن کارپوریشن کے حسب خواہش میں اس کے بعد بھی وہاں کام کرتا رہا۔دسمبر ۱۹۵۳ء میں کارپوریشن نے خواہش ظاہر کی کہ میں مستقل بنیاد پہ کارپوریشن سے منسلک ہوجاؤں لیکن میں نے صرف جنوری ۱۹۵۴ء تک وہاں کام کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء میں کارپوریشن کی ملازمت سے سبکدوشی حاصل ہوگئی اور نیشنل بینک کی جانب سے رحیم یارخاں برانچ میں تعینات کردیا گیا۔

نومبر ۱۹۵۴ء میں نیشنل بینک آف پاکستان کی برانچ قائم کرنے کے لئے میرا تبادلہ بحیثیت منیجر رحیم یارخاں سے پسنی کردیا گیا۔اس وقت کراچی سے پسنی آنے جانے کے لئے بحری جہاز کا ذریعہ تھا بعض تاجر حضرات لانچ کے ذریعے بھی آمدورفت کرتے تھے۔تقریباً دوسال بعد میں کراچی واپس آگیا۔ مقامی اور کراچی سے باہر مختلف برانچوں میں بحیثیت منیجر تھوڑے تھوڑے عرصے کے لئے عارضی طور پر کام کرنے کے بعد پرنسپل آفس کراچی میں تعینات ہوگیا۔

مارچ ۱۹۵۹ء میں بحیثیت منیجر لاڑکانہ برانچ تبادلہ ہو گیا چار سال سے زیادہ عرصہ تک وہیں تعینات رہا اس کے بعد میرا تبادلہ حیدر آباد ہو گیا۔ ۱۹۶۵ء میں کراچی واپس آ گیا، کم و بیش سات سال آڈٹ اینڈ انسپکشن اور فائنانس ڈویژن میں تعینات رہنے کے بعد ۱۹۷۲ء میں ایڈمنسٹریشن ڈویژن کی پرسنل ونگ میں بحیثیت سینئر وائس پریذیڈنٹ تعینات ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ایڈمنسٹریشن ڈویژن کے دیگر تمام شعبوں کی ذمہ داری بھی مجھے تفویض کر دی گئی مسلسل بارہ سال ایڈمنسٹریشن ڈویژن سے وابستہ رہنے کے بعد پانچ جولائی ۱۹۸۷ء میں بحیثیت ایکزیکیوٹیو وائس پریذیڈنٹ ملازمت سے ریٹائر ہو گیا۔

مضمون نویسی کا شوق مجھے طالب علمی کے زمانے سے تھا اور اگست ۱۹۶۷ء تک میرے مضامین مختلف اخباروں اور جریدوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ یکسر منقطع ہو گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ۱۹۸۷ء میں عمرہ اور ۱۹۸۸ء میں حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد ارادہ تھا کہ مضمون نویسی کا سلسلہ از سر نو شروع کروں گا لیکن اسی دوران بینک کے سابق صدر عبدالجبار خان صاحب نے مجھے ٹیلی فون پر بتایا کہ ان کا ارادہ ہے کہ ایک منیجمنٹ کنسلٹینسی قائم کی جائے اور خواہش ظاہر کی کہ مجوزہ کمپنی میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے میں بھی شمولیت اختیار کر لوں اس سلسلے میں جبار خاں صاحب سے تفصیلی ملاقات کے بعد میں نے اپنی رضامندی دے دی۔ جبار صاحب کی ایما پر نیشنل بینک کے سابق ممبر

بورڈ اور بینک الجزیرہ کے سابق جنرل منیجر اطہر حسین صاحب اور اسٹیٹ بینک کے سابق ایگزیکٹیو ڈائریکٹر سید عبداللہ صاحب نے بھی اس کمپنی میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کرلی۔ اس طرح بنیادی طور پر چار ڈائریکٹر صاحبان کی نگرانی میں کمپنی قائم ہو گئی۔ عبدالجبار صاحب کمپنی کے ڈائریکٹر اور چیف ایگزیکٹیو تھے۔ تقریباً دو سال تک یہ کمپنی کام کرتی رہی بعد میں جب عبدالجبار صاحب کو سعودی عرب کے ایک ادارہ سے وابستہ ہونا پڑا تو طے کیا گیا کہ اس کمپنی کو دوسرے لوگوں کے سپرد کر کے ہم سب سبکدوش ہو جائیں۔ کمپنی کے ڈائریکٹر صاحبان سے اس سلسلے میں گفت وشنید ہوئی تو وہ تیار ہو گئے۔ اس سلسلے میں تمام قانونی کاروائی کی تکمیل کے بعد ہماری کمپنی نئے ڈائریکٹر صاحبان کے سپرد کر دی گئی۔

اس دوران ماہنامہ الامیر کے ایڈیٹر سید اشتیاق حسین صاحب کئی مرتبہ خواہش ظاہر کر چکے تھے کہ میں مضامین تحریر کرنے کا سلسلہ دوبارہ شروع کروں چنانچہ ۱۹۹۱ء سے میں نے الامیر میں لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ کئی برسوں تک جاری رہا۔ اسکے علاوہ روزنامہ جنگ کراچی، روزنامہ مساوات کراچی اور ماہنامہ خواجگان لاہور میں بھی میرے مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ ان میں سے چند مضامین بعض اخبارات نے اپنے شمارے میں ازخود نقل کئے۔

میرے تیرہ شائع شدہ دینی مضامین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی علیہ السلام، حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے بارے میں تھے۔ ان تمام

مضامین کا مجموعہ ۲۰۰۱ء میں ''افکار عقیدت'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ مضامین ''افکار حقیقت قیام پاکستان کے تناظر میں'' ان بیس مضامین پر مشتمل ہے جو قائداعظمؒ، سر سید احمد خان، راجہ صاحب محمود آباد، لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور تحریک پاکستان کے حوالے سے تحریر کئے گئے تھے۔ ممکن ہے کہ مضامین کا یہ مجموعہ ان حضرات کیلئے کچھ زیادہ اہمیت کا حامل نہ ہو جنہوں نے تحریک پاکستان میں خود حصہ لیا یا قیام پاکستان کے حوالے سے بہت زیادہ مطالعہ رکھتے ہیں لیکن ہمارے ان نوجوانوں کیلئے جنہیں تحریک پاکستان اور قیام پاکستان سے زیادہ واقفیت نہیں ہے ان کیلئے اس مجموعہ میں مفید معلومات یقیناً حاصل ہو جائیں گی۔

مضامین کے اس مجموعہ کی طباعت و تزئین میں مجاہد حسین حر صاحب نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہر ممکن معاونت کی جس کیلئے میں ان کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صحت و سلامتی کے ساتھ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔......آمین

سید کلب المرتضیٰ نقوی

دسمبر ۲۰۰۷ء

حصہ اول

قائداعظم محمد علی جناحؒ

اور

چند دیگر شخصیات

قائداعظمؒ کی یاد میں

قائداعظم محمد علی جناحؒ کی وفات گیارہ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہوئی۔ میں اُس وقت میں لکھنؤ اپنے بڑے بھائی جناب سید کلب مصطفیٰ صاحب کے ساتھ رہائش پذیر تھا اور چند ماہ بعد پاکستان ہجرت کرنے کا مصمم ارادہ تھا۔ وہم وگمان میں نہ تھا کہ میرے پاکستان پہنچنے سے قبل بانی پاکستان اپنے خالق حقیقی سے جاملیں گے۔ قائداعظمؒ کے انتقال کی خبر ہندوستان کے تقریباً تمام شہروں میں بین الاقوامی خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعہ اُسی روز پہنچ گئی ہوگی اور لوگوں کو اس کا علم بھی ہو چکا ہوگا لیکن اتفاق کی بات کہ یہ خبر مجھے گیارہ ستمبر کو نہ مل سکی۔ بارہ ستمبر کی صبح صادق کا وقت تھا۔ سورج کی کرنیں نیلگوں آسمان سے نمودار نہ ہوئی تھیں، میں پورے طور پر نیند سے بیدار نہ ہونے پایا تھا کہ اچانک ایک غیر مسلم اخبار فروش کی آواز کانوں سے ٹکرائی:

> ''ایک زبردست خبر، محمد علی جناح مر گئے، سب سے بڑی تازہ خبر، جناح کا دیہانت ہوگیا، گرما گرم خبر، محمد علی جناح چل بسے''۔

یہ سن کر ایسا محسوس ہوا جیسے میرے جسم سے جان نکل گئی لپک کر اپنے گھر کے باہر اُس حصہ میں پہنچا جہاں اخبار فروش انگریزی روزنامہ پانیر (PIONEER) رکھ دیا کرتا تھا۔ اخبار فروش جا چکا تھا لیکن اُس کی صدا اب بھی سنائی دے رہی تھی۔

اخبار ہاتھ میں لئے گھر میں داخل ہوا، بچے اب تک محوخواب تھے دیگر افراد قائداعظمؒ کے انتقال کی روح فرسا خبر سن کر جاگ چکے تھے، سب لوگ سکتہ کے عالم میں ملول وافسردہ بیٹھے تھے۔ میں اُن کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ بلند آواز سے اخبار پڑھنے کی کوشش کی لیکن الفاظ حلق میں اٹک رہے تھے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح خبر پڑھ کر سنائی، گھر کے تمام افراد سر جھکائے خاموشی کے ساتھ سنتے رہے، اُن کی پلکیں آنسوؤں سے بوجھل ہو رہی تھیں، لب خاموش تھے، بے زبانی ہماری زبان بن گئی تھی، ہم سب ایک دوسرے کو دل ہی دل میں پرسہ دے رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنے غم کا اظہار کس طرح کریں، دل کا غبار کیونکر دور کریں اور قائداعظمؒ سے جو عقیدت ہے اسے کیسے عیاں کریں۔

ہم لوگ کچھ دیر تک اسی طرح گم سم بیٹھے رہے۔ اچانک میرے برادر بزرگ نے کہا کیوں نہ قائداعظمؒ کی یاد میں گھر پر ایک تعزیتی نشست کا اہتمام کیا جائے۔ اس معقول تجویز کی سب نے حمایت کی میرے پڑوس کے ایک مکان میں چند مسلمان آباد تھے خیال آیا کہ انہیں بھی مدعو کر لیا

جائے۔ بلانے گیا تو دیکھا کہ وہ لوگ بھی دل افسردہ ولب بستہ بیٹھے تھے۔ میں نے مجوزہ تعزیتی نشست کا ذکر کیا تو شرکت کے لئے سب فوراً تیار ہو گئے۔ واپس آ کر میں نے اطلاع دی کہ ہمسائے آ رہے ہیں۔ چند منٹوں میں گھر کے سب سے بڑے کمرے میں نشست کا اہتمام کر دیا گیا۔ اتنی دیر میں ہمارے پڑوسی بھی آ گئے۔ بڑے کمرے سے ملحق برآمدہ تھا۔ خواتین دروازہ کی اوٹ میں وہاں بیٹھ گئیں۔ ایک عجیب الم انگیز ماحول تھا۔ سب لوگ غمگین وغمزدہ تھے۔

ہندوستان میں غالباً یہ پہلا تعزیتی جلسہ تھا جو قائداعظمؒ کی یاد میں منعقد کیا جا رہا تھا بعض دیگر وجوہ کی بنا پر بھی یہ جلسہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد تھا۔ حاضرین کی مجموعی تعداد آٹھ دس نفوس پر مشتمل تھی۔ جلسہ کا کوئی صدر تھا نہ کوئی مہمان خصوصی۔ سب سے پہلے قائداعظمؒ کی روح کے ایصال ثواب کے لئے فاتحہ خوانی کی گئی اسکے بعد جلسہ کا آغاز ہونا تھا۔ ہم سب کا خیال تھا کہ اس موقع پر میرے بڑے بھائی سید کلب مصطفیٰ صاحب ہمارے جذبات واحساسات کی ترجمانی کریں گے اس لئے کہ وہ حاضرین مجلس میں نہ صرف عمر میں سب سے بڑے تھے بلکہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ممبر ہونے کے علاوہ ایک شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ تحریک پاکستان کی حمایت میں ان کی تقاریر فراموش نہیں کی جا سکتیں لیکن اُنہوں نے مجھے تقریر کرنے کی ہدایت کی۔ ذہنی طور پر میں اس کے لئے قطعاً تیار نہ تھا مگر میرے لئے انکار

کرنا ممکن نہ تھا۔ بہر حال میں نے تقریر شروع کی جو کم و بیش مندرجہ ذیل الفاظ پر مشتمل تھی۔

''آج ہم اپنے عظیم قائد کی وفات پر تعزیت کیلئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ہم اپنے اُس محبوب قائد کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد اور خود مختار سلطنت قائم کی۔ ہم اس عظیم المرتبت رہنما کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کیلئے اکٹھا ہوئے ہیں جس نے اپنی سیاسی بصیرت اور دانشمندانہ حکمت عملی سے اپنے دونوں حریفوں یعنی کانگریس اور حکومت برطانیہ کو بیک وقت شکست فاش دی۔ پاکستان کے دارالحکومت کراچی کے لوگ خوش قسمت ہیں کہ وہ آج اس عظیم رہنما کے جنازہ کو کاندھا دیں گے۔ عقیدت کے پھول چڑھائیں گے۔ دل کھول کر سوگ منائیں گے' اشک افشانی کریں گے' اپنے جذبات واحساسات کا برملا اظہار کرینگے لیکن اے میرے محبوب و عظیم قائد! ہندوستان میں آپ کے تمام عقیدت مند بھی آپ کی وفات پر اتنا ہی غمگین و غم دیدہ ہیں جتنا کہ ہمارے پاکستانی بھائی۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ ہم اپنی تمام مجبوریوں' محرومیوں اور بندشوں کے باوجود آپ کو خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔ آپ کا غم منانے میں ہم اپنے پاکستانی بھائیوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں''۔

میری تقریر اس مرحلہ پر تھی کہ برآمدے میں فرو کش خواتین کے رونے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ کمرہ میں بیٹھے ہوئے بعض افراد بھی اشکبار تھے۔خود میری آواز گلوگیر ہوگئی۔ بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو حاصل کر کے تقریر کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔

''اے میرے عظیم قائد! میں وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو آپ جیسی بلند و بالا شخصیت کی عکاسی کر سکیں۔آپ کا کردار بے داغ' آپ کی سیاسی بصیرت لاجواب' آپ کی راست بازی نایاب' آپ کی حاضر دماغی فقید المثال' آپ نے کبھی اصولوں پر سودے بازی نہیں کی' آپ نے کبھی مصلحتوں سے کام نہیں لیا، آپ کے قول وفعل میں کوئی تضاد نہ تھا، آپ نے مسلمانان ہند کی عظمت رفتہ کو جلا بخشی، اُنہیں حوصلہ دیا، مولانا محمد علی' سر سلطان آغا خان' ڈاکٹر اقبال اور دیگر ممتاز مسلم لیڈران کی نگاہوں میں آپ سے بہتر دوسرا کوئی رہنما نہیں تھا جو مسلمانانِ ہند کی قیادت کو سنبھال سکتا۔آپ نے اُنہیں مایوس نہیں کیا۔آپ قوم کی امنگوں پر پورے اترے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پاکستان بنانے کے لئے پیدا کیا تھا اور جب یہ مشن مکمل ہوگیا تو آپ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ آپ تمام مسلمانوں کے محسن ہیں۔آپ ہمارے مسیحا ہیں۔ہم آپ کی عظمتوں کو سلام کرتے ہیں۔ہم آپ پر عقیدت کے پھول نچھاور

کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو غریق رحمت کرے۔ محمدؐ اور علیؑ کے صدقہ میں رب جلیل آپ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ ہم آپ کو کبھی فراموش نہ کرسکیں گے۔ خدا حافظ! میرے محبوب قائد خدا حافظ!"۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

خواتین کی ہچکیوں، سسکیوں اور آہوں کے درمیان میں نے تقریر ختم کی۔ کمرہ میں بیٹھے ہوئے بعض حضرات بھی خاموش سر جھکائے اپنے مرحوم قائد پر محبت و عقیدت کے آنسو نچھاور کر رہے تھے۔ جلسہ ختم ہوا۔ تھوڑی دیر بعد جب غم انگیزی میں بتدریج کمی ہوئی تو قائداعظمؒ کی خدمات اور اُن کے کارناموں کا تذکرہ ہونے لگا۔ صبح کے تقریباً نو بج چکے تھے۔ پڑوس سے آنے والے حضرات رخصت ہوگئے۔ گھر کے افراد اب بھی سوگوار تھے۔ کسی نے اب تک ناشتہ نہیں کیا تھا۔ والدہ ماجدہ کے اصرار پر بسکٹ اور اسی قسم کی دوسری اشیاء خورد و نوش سے جو گھر میں دستیاب ہوسکیں ناشتہ ہوا۔ دوپہر اور رات کو بھی اسی طرح کچھ نہ کچھ کھا لیا گیا۔ اُس روز ہمارے گھر میں چولہا نہیں جلا اور مجھے یقین ہے کہ پاک و ہند میں قائداعظمؒ کے عقیدتمندوں کے اکثر گھروں میں یہی صورت حال رہی ہوگی۔ بارہ ستمبر ۱۹۴۸ء منعقد ہونے والے اس جلسہ کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا لیکن اس کی یاد میرے دل میں آج بھی تازہ ہے۔

قائداعظمؒ

قائداعظم محمد علی جناحؒ کراچی شہر میں [redacted] روز اتوار پیدا ہوئے۔ چھ سال کی عمر میں سندھ مدرسۃ الاسلام [redacted] داخل ہوئے۔ ۱۸۹۱ء میں آپ رشتہ ازدواج سے منسلک ہوگئے۔ [redacted] جب کہ آپ کی عمر صرف سولہ سال تھی قانون کی تعلیم [redacted] لئے لندن تشریف لے گئے اور وہاں سے بیرسٹری کی سند لے کر ۱۸۹۶ء میں کراچی واپس آئے۔ اس درمیانی مدت میں آپ ماں سے [redacted] آپ کی اہلیہ محترمہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ باپ کو تنگدستی نے گھیر لیا۔ مال و متاع رخصت ہو چکا تھا اور نیونہم روڈ پر دو کمروں کے مکان کے علاوہ گویا کچھ بھی باقی نہ رہا۔ کراچی کے حالات کو ناسازگار پا کر قائداعظم ۱۸۹۷ء میں بمبئی [redacted] چلے گئے۔ وہاں تین سال تک غم روزگار اور کشمکش حیات کا شکار رہے لیکن بعد میں حالات بتدریج بہتر ہوتے گئے۔ ۱۹۰۰ء میں آپ پریزیڈنسی مجسٹریٹ کے عہدہ پر فائز ہوئے جو اس زمانے میں ایک [redacted] کے لئے حاصل کر لینا تقریباً ناممکن تھا۔ یہ عہدہ عارضی مدت کے لئے تھا۔ بعد میں

جب آپ کو مستقل طور پر یہ عہدہ پیش کیا گیا تو آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وکالت شروع کی اور بہت تھوڑے عرصے میں ایک نمایاں اور کامیاب وکیل کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔

قائداعظم کی سیاست میں حصہ لینا

قائداعظمؒ کا خیال تھا کہ کسی شخص کو سیاست میں اس وقت تک حصہ نہیں لینا چاہئے جب تک کہ وہ خود اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جائے۔ اس اصول پر قائداعظمؒ سختی کے ساتھ عمل پیرا رہے چنانچہ ۱۹۰۶ء تک آپ نے سیاست میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ ۱۹۰۶ء میں آپ انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہوئے اور اپنی ہمت و جرأت۔ کے ایسے جوہر دکھائے کہ لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ قائداعظمؒ امپیریل لیجسلیٹو کونسل (Imperial Legislative Council) کے ممبر منتخب ہو چکے تھے، کونسل کے ایک اجلاس میں جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی حالت زیرِ بحث تھی۔ جناح معظمؒ نے اپنی تقریر کے دوران ارشاد فرمایا:

"جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ جو سخت اور ظالمانہ برتاؤ کیا جا رہا ہے اس نے ملک کے تمام لوگوں کے جذبات کو برانگیختہ کر دیا ہے"۔

لارڈ منٹو وائسرائے ہند کو "سخت" اور "ظالمانہ" جیسے الفاظ پسند نہ آئے حاکمانہ جذبے کو ٹھیس پہنچی۔ تڑپ کر اٹھے اور کہا:

"ظالمانہ" غیر مناسب لفظ ہے۔ محترم ممبر کو معلوم ہونا چاہئے

کہ جنوبی افریقہ سے سلطنت برطانیہ کے دوستانہ تعلقات ہیں۔اس قسم کے الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئے''۔

قائداعظمؒ نے جواب دیا:

''حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس سے بھی سخت الفاظ استعمال کرنا چاہتا ہوں لیکن میں کونسل کے قواعد وضوابط سے بخوبی واقف ہوں اسی لئے میں حد سے تجاوز کرنا نہیں چاہتا''

۱۹۱۶ء میں بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگٹن نے محمد علی جناحؒ اوران کی بیگم رتن بائی کی دعوت کی۔لیڈی ولنگٹن کو بیگم محمد علی جناح کی پوشاک غیر مناسب نظر آئی جس کا انہوں نے اظہار بھی کردیا۔قائداعظمؒ کو یہ بات اس قدر ناگوار معلوم ہوئی کہ آپ فوراً گورنمنٹ ہاوس سے اپنی اہلیہ محترمہ کو ساتھ لے کر واپس چلے گئے۔

کانگریس میں شرکت

کانگریس میں شریک ہونے کے بعد قائداعظمؒ ملک کی آزادی کے لئے پرخلوص جدوجہد کرتے رہے۔ان کی دلی آرزو تھی کہ ہندواور مسلمان متحد ہوجائیں۔مسز سروجنی نائیڈو نے قائداعظمؒ کو''ہندو مسلم اتحاد کے سفیر'' کالقب دیا لیکن رفتہ رفتہ آپ کو یقین ہوگیا کہ کانگریس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ملک پراکثریت کاراج قائم کردیا جائے۔۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ پیش ہونے کے بعد ہندو مسلم اتحاد کی تمام امیدیں ختم ہوگئیں آپ کی جائز اور معقول تجاویز مسترد کردی گئیں۔قائداعظمؒ کے لئے یہ بہت ہی دلسوز

اور تلخ تجربہ تھا۔ کانگریس کی مسلم کش پالیسی نے آپ کو بہت بددل کر دیا اور وہ دوسرے روز صبح کو کلکتہ سے واپس چلے گئے۔ جمشید نوشیرواں جی قائداعظمؒ کو رخصت کرنے ہوڑہ اسٹیشن پر آئے تھے انہوں نے قائداعظمؒ کی آنکھوں میں آنسو مچلتے ہوئے دیکھے۔ بے مہری یاران وطن کا یہ نتیجہ ہوا کہ قائداعظمؒ مستقل سکونت کے خیال سے ۱۹۳۰ء میں لندن چلے گئے لیکن قائد ملت لیاقت علی خان کے بیحد اصرار پر ۱۹۳۴ء میں پھر ہندوستان واپس آئے۔

قائداعظمؒ کانگریس کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ اب انہوں نے مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم شروع کی، مسلمانوں کو متحد کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس وقت زیادہ تر مسلمان کانگریس میں شریک تھے۔ صوبہ سرحد میں کانگریس کا غلبہ تھا۔ سندھ میں مسلم لیگ کو بہت کم حمایت حاصل تھی لیکن قائداعظمؒ نے ہمت نہ ہاری۔ لکھنؤ کے تاریخی اجلاس میں آپ نے کھلے الفاظ میں اعلان کیا کہ اکثریت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کانگریس کی موجودہ پالیسی آپس میں افتراق پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ قائداعظمؒ کو اپنے مقصد میں مسلسل کامیابی ہوتی گئی۔ مسلم لیگ کا زور بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مطالبۂ پاکستان پیش کیا گیا اور اگست ۱۹۴۷ء میں یہ خواب حقیقت بن گیا۔ قائداعظمؒ کی حیرت انگیز کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ انہیں اپنے مقصد میں یقین محکم تھا۔ آپ اپنے مشن پر انتہائی ایمانداری اور دیانتداری سے عمل پیرا تھے۔ آپ میں عزم تھا، استقلال تھا،

بے پناہ ہمت و جرأت تھی، آپ ایک سچے محبّ وطن تھے جو ملک وقوم کی آزادی کے لئے تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ یہ قائداعظمؒ اور صرف قائداعظمؒ ہی کا کام تھا کہ آپ نے نہ صرف کانگریس کا منہ موڑ دیا بلکہ حکومت برطانیہ سے نبردآزما ہوکر ایک نئی اور خودمختار سلطنت کی بنیاد رکھی۔

پاکستان کے قیام' اس کی بقااور استحکام کے لئے قائداعظمؒ نے اس قدر محنت اور جانفشانی سے کام لیا کہ آپ کی صحت خراب ہوگئی۔ تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے جون ۱۹۴۸ء کوئٹہ تشریف لے گئے۔ طبیعت کافی ناساز ہوچکی تھی، ضعف بڑھ رہا تھا۔ اس کے باوجود جولائی کی پہلی تاریخ کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی رسم افتتاح کے لئے کراچی تشریف لائے۔ رسم افتتاح کے بعد کوئٹہ واپس پہنچے تو طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی چنانچہ آپ کو زیارت منتقل کردیا گیا قائداعظمؒ زیارت تشریف لے گئے۔ لیفٹنٹ کرنل ڈاکٹر الٰہی بخش نے علاج شروع کیا لیکن حالت تیزی کے ساتھ بگڑتی گئی۔ بتاریخ آٹھ اگست آپ کو زیارت سے کوئٹہ لایا گیا۔ سولہ اگست کو طبیعت سنبھل گئی اور آپ نے تھوڑا بہت کام کرنا شروع کردیا۔ ڈاکٹر الٰہی بخش نے جب قائداعظمؒ کو بتایا کہ ان کی حالت میں ۴۰ فیصد افاقہ ہوا ہے تو آپ نے دریافت کیا کہ سو فیصد افاقہ کب ہوگا؟ قائداعظمؒ کی آرزو تھی کہ کراچی واپس جائیں لیکن اس وقت جب انہیں مکمل طور پر صحت ہو جائے اور وہ خود چل پھر سکیں۔ قائداعظمؒ کو اپنی صحتیابی کی امید تھی لیکن انتیس اگست کو یہ امید ٹوٹ گئی۔ پانچ ستمبر کو

قائداعظمؒ نمونیہ کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ نیم بیہوشی کے عالم میں آپ کہہ رہے تھے: ''کشمیر کمیشن نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ لوگ کیوں نہیں آئے۔ وہ لوگ کہاں ہیں''۔ موت قائداعظمؒ کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے بڑھ رہی تھی لیکن ملک وقوم کا مفاد اب بھی آپ کے پیش نظر تھا۔ دس ستمبر کو محترمہ فاطمہ جناح کو بتایا گیا کہ قائد کی زندگی کے آثار بہت کم ہیں۔ دوسرے روز قائداعظمؒ کو بذریعہ ہوائی جہاز کراچی لایا گیا۔ ساڑھے چار بجے شام کو ہوائی جہاز کراچی کے ماری پور ہوائی اڈے پر اترا۔ وہاں سے گورنر جنرل ہاؤس پہنچتے پہنچتے قائداعظمؒ کی حالت اور خراب ہوگئی۔ ڈاکٹروں نے انجکشن دیئے۔ رات کے تقریباً دس بجے ڈاکٹر نے قائداعظمؒ سے کہا: ''میں نے انجکشن دیئے ہیں۔ خدا نے چاہا تو آپ زندہ رہیں گے۔'' یہ سن کر قائداعظمؒ نے مایوسی کے ساتھ جواب دیا ''نہیں میں زندہ نہیں بچوں گا'' اور یہی ہوا، نصف گھنٹہ بعد آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ہمارا محبوب قائد ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے
۱۱ ستمبر ۱۹۴۸
رخصت ہو گیا۔ قائداعظمؒ کی موت ہماری تاریخ کا المناک اور ناقابل فراموش سانحہ ہے۔ آج قائداعظمؒ موجود نہیں ہیں لیکن ان کی یاد ہمارے دلوں میں بدستور باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ قائداعظمؒ کا شمار ان ہستیوں میں ہے جو مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بانئ پاکستان

۱۸۵۷ء کی غیر منظم اور ناکام جنگ آزادی کے بعد برصغیر ہند کے مسلمانوں کو شکست خوردگی اور مایوسی نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ صرف یہی نہیں کہ ان کے ہاتھوں وہ تخت و تاج نکل گیا جس کے مالک و مختار مسلمان تقریباً ایک ہزار برس تک رہ چکے تھے بلکہ ان کا وقار، ان کی عظمت اور مرکزیت بھی ختم ہوگئی۔ حاکم، محکوم بن گئے اور محکوم، صاحبانِ اقتدار بن بیٹھے۔ عجیب پراگندگی کا عالم تھا۔ تباہی اور مکمل تباہی مسلمانان ہند کا مقدر بن گئی تھی۔ انگریز مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھ کر انہیں پوری قوت سے کچلنے کے لئے کمربستہ ہوگئے۔ غیر مسلموں کی مؤثر مدد سے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم توڑے گئے اور انہیں مکمل طور پر تباہ و برباد کردینے کی ہر امکانی کوشش کی گئی۔ مسلمانوں کی حالت یقیناً ناگفتہ اور عبرتناک ہوچکی تھی۔ اُن کے سامنے اب سوال یہ نہیں تھا کہ ترقی کیونکر کریں بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ اس عفریت کا مقابلہ کس طرح کریں جو انہیں زندہ درگور کئے دے رہا تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں کسی مسلمان کا مفلس ہونا تقریباً ناممکن سمجھا جاتا تھا

لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد آہستہ آہستہ بتدریج یہ حالت ہوگئی کہ ہندوستان میں دولت مند مسلمانوں کا فقدان ہوگیا۔ غریب اور بیکسوں کی دستگیری کرنے والے بعض مسلمانوں کے ہاتھوں میں کاسۂ گداگری پہنچ گیا۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کو ملت اسلامیہ کے دردمندوں نے محسوس کیا، سرسید احمد خان' محسن الملک' وقار الملک اور دیگر رہبران قوم نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا لیکن حالات اس قدر مایوس کن ہو چکے تھے اور مرض اس قدر شدت اختیار کر چکا تھا کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی مکمل کامیابی حاصل نہ ہوسکی یہاں تک کہ ۱۸۷۶ء میں کراچی شہر کے ایک مسلمان تاجر کے یہاں ۲۵ دسمبر کو اتوار کے دن ایک بچہ کی ولادت ہوئی۔ عزیز واقارب، دوست واحباب مبارکباد پیش کرنے کے لئے جمع تھے۔ بچہ کی درازیٔ عمر اور بلندیٔ اقبال کے لئے لوگ دعائیں دے رہے تھے لیکن حاضرین میں سے کسی ایک نے بھی یہ خیال نہ کیا ہوگا کہ اس معصوم بچہ کی مٹھی میں برصغیر ہند کے مسلمانوں کی قسمت محفوظ ہے۔ نہ کسی نے یہ اندازہ لگایا ہوگا کہ یہی بچہ ایک دن مسلمانان ہند کی مسیحائی کرے گا اور ستر سال بعد ان کے لئے ایک آزاد وخود مختار سلطنت قائم کرے گا۔ اس عظیم المرتبت ہستی کو آج قائداعظم محمد علی جناحؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

قائداعظمؒ کی ابتدائی زندگی کے مفصل حالات ہمارے علم میں نہیں ہیں لیکن بیس سال کی عمر میں بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر لینا اور چوبیس سال کی عمر میں

پریزیڈنسی مجسٹریٹ کے عہدہ پر فائز ہوجانا قائداعظمؒ کی ذہانت' قابلیت اور اہلیت کے ناقابل انکار ثبوت ہیں۔ اپنی زندگی کے ناسازگار حالات کا مقابلہ ۱۸۹۶ء سے لے کر ۱۹۰۰ء تک آپ نے جس پامردی کے ساتھ کیا وہ قائداعظمؒ کے عزم واستقلال' ہمت وجرأت کا آئینہ دار ہے۔

انگلستان سے واپسی کے بعد کئی سال تک قائداعظمؒ نے ہندوستان کی سیاست میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا۔ ۱۹۰۶ء میں آپ نے آل انڈیا کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور اپنی انتھک اور پُرخلوص کوشش سے اسے اس مقام پر پہنچادیا جہاں اسے مدتوں پہنچنا نصیب نہ ہوتا۔ قائداعظمؒ کی دلی آرزو تھی کہ ہندو اور مسلمان متحد ہوجائیں لیکن دلخراش و دل شکن مشاہدات اور تلخ تجربات نے ثابت کردیا کہ کانگریس کے پیش نظر مسلمانوں کا مفاد نہیں ہے اور اس کی تمام سیاسی جدوجہد کا مقصد صرف یہ ہے کہ ملک میں اکثریت کا راج قائم ہوجائے اور اس طرح مسلمانان ہند انگریزوں سے نجات حاصل کرلینے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غیر مسلموں کے غلام بن جائیں۔ قائداعظمؒ نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن آپ کانگریسی ذہنیت کو تبدیل نہ کرسکے۔ نہرو رپورٹ میں قائداعظمؒ کی مناسب اور جائز ترامیم کو یکسر نظر انداز کردیا گیا۔ اس واقعہ نے قائداعظمؒ کی سیاسی زندگی میں انقلاب برپا کردیا۔ آپ کو یقین ہوگیا کہ آل انڈیا کانگریس کا اصل مقصد اکھنڈ بھارت قائم کرنا ہے۔ اسے مسلمانوں کے مفادات کا

کوئی لحاظ و پاس نہیں ہے۔ قائداعظمؒ کو اب ایک نئی منزل کا تعین کرنا تھا۔
چنانچہ ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ کے تاریخی شہر میں آپ نے ایک تیسری پارٹی کی تنظیم نو کا آغاز کیا۔ قائداعظمؒ مسلمانان ہند کی نشاۃ ثانیہ کی طرف متوجہ ہوئے تو کانگریس نے ایک طوفان اٹھالیا، آپ کو ہندوستان کا سب سے بڑا دشمن گردانا گیا، برٹش ایجنٹ کے نام سے یاد کیا گیا، آزادی کا دشمن بتایا گیا۔ کانگریسیوں کا ذکر کیا مسلمانوں کی بعض مذہبی جماعتوں نے بھی آپ کی مخالفت کی لیکن قائداعظمؒ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آپ ایک سخت چٹان کی طرح اپنے ارادوں میں اٹل رہے۔ مخالفت ہوتی رہی اور کارواں اپنی راہ چلتا رہا۔

قائداعظمؒ خوب سمجھتے تھے کہ کانگریس سے سمجھوتہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب مسلمانوں میں مکمل اتحاد و اتفاق ہو۔ حقیقی سمجھوتہ اسی حالت میں ممکن ہے جب دونوں فریق ہم پلہ ہوں۔ ایک کمزور فریق کی جانب سے صلح کی کوشش اس کی کمزوری کے مترادف ہوتی ہے۔ یہی سبب تھا کہ قائداعظمؒ مسلمانان ہند کو منظّم و متحد کرنا چاہتے تھے۔ یہ کام انتہائی مشکل تھا۔ مسلمانوں کو نہ صرف برطانوی حکومت سے سابقہ تھا بلکہ ان کے مدمقابل ایک ایسی قوم تھی جو عرصہ دراز سے ترقی کی منزلیں تیزی کے ساتھ طے کرتی چلی آرہی تھی۔ ان تمام دشواریوں کے باوجود قائداعظمؒ کی پُرخلوص جدوجہد اور آپ کے عزم واستقلال نے ہندوستان کے مسلمانوں کو سات سال کی

مختصر مدت میں ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ کانگریس نے مسلم اتحاد کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن قائداعظمؒ کی مدبرانہ قیادت نے کانگریس کی تمام آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا۔ مسلمانوں کی تنظیم جاری رہی اور آل انڈیا مسلم لیگ روز بروز ترقی کرتی رہی۔ ۱۹۳۷ء میں جس پارٹی کے وجود سے پنڈت جواہر لال نہرو انکار کر رہے تھے، جس کے پاس کوئی واضح لائحہ عمل نہ تھا، جس پارٹی کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا وہی پارٹی ۱۹۴۰ء میں انتہائی خوداعتمادی اور عزم کے ساتھ قائداعظمؒ کی رہبری میں اپنی منزل مقصود ''پاکستان'' کی طرف رواں دواں تھی۔

قائداعظمؒ کے اعلیٰ کردار، عزم واستقلال اور سیاسی تدبر کو سامنے رکھا جائے تو قائداعظمؒ جیسا صاحب کردار سیاستدان، مدبر اور رہبر نظر نہیں آتا۔ آپ کی حیرت انگیز کامیابی کا راز آپ کے کردار کی بلندی میں مضمر تھا۔ قائداعظمؒ کے قول وفعل میں انتہائی مطابقت تھی۔ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے ساٹھ سال کی عمر میں ایک بے یارومددگار، غیر منظم، غیر متحد اور مفلس قوم کی قیادت سنبھالی اور صرف دس سال کی مختصر مدت میں کسی فوجی طاقت اور عسکری قوت کے بغیر ایک آزاد اور خود مختار مملکت عالم وجود میں لے آئے اور اس طرح ہندوستان کی جغرافیائی حدود کو بدل کر ایک سنہری اور روشن تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ قائداعظمؒ کی سیاسی جدوجہد کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانانِ ہند کی مٹی ہوئی عظمت اور کھوئی ہوئی خوداعتمادی

بحال ہو جائے۔ آپ برصغیر ہند میں حیات ملی کی بقا اور ملت اسلامیہ کے وجود کے لئے ایک قومی وطن کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں کی باعزت زندگی کا یہی واحد حل تھا۔ قائداعظمؒ نے ہمیں علم و عمل اور اتحاد و اتفاق کا سبق دیا ہے۔ آپ بخوبی جانتے تھے کہ اتحاد اور اتفاق قوت کا دوسرا نام ہے۔ پراگندگی میں تباہی اور شیرازہ بندی میں کامیابی و کامرانی ہے۔ حقیقی کامیابی کا حصول اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہم اتحاد، تنظیم اور یقین محکم کے اصولوں پر عمل پیرا نہ ہوں (جو آج بھی ہمارے پاس قائداعظمؒ کی امانت ہیں)۔ اگر ہم پاکستان کو مضبوط و مستحکم دیکھنا چاہتے ہیں، اگر ہم ایک زندہ قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری مٹی ہوئی عظمت اور کھویا ہوا وقار پلٹ آئے اگر ہم اپنے درخشاں ماضی کو حال میں بدلنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے کردار کو بلند اور اعمال کو صالح رکھنا لازم ہے۔

قائداعظمؒ ایک عظیم رہبر

پچیس دسمبر ۱۸۷۶ء بروز اتوار جناح پونجا کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹا عطا کیا۔ والدین فطری طور پر بیحد مسرور وشادمان تھے۔ عزیز واقارب' دوست واحباب مبارکباد دینے کیلئے آرہے تھے۔ بچہ کو درازئ عمر اور اس کے اقبال کی بلندی کے لئے دعائیں دی جارہی تھیں لیکن کسی کے خواب و خیال میں نہ تھا کہ یہ بچہ مستقبل میں ایک تاریخ ساز شخصیت اور عظیم رہبر بن کر برصغیر ہند کے سیاسی افق پر ماہ تاباں بن کر چمکے گا اور مسلمانان ہند کیلئے ایک آزاد اور خودمختار سلطنت قائم کر کے تاریخ میں اپنا نام اور مقام ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چھوڑ جائے گا۔ قائداعظمؒ کی عمر صرف سولہ سال تھی جب آپ ۱۸۹۲ء میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لندن تشریف لے گئے اور صرف چار سال کے عرصہ میں بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر کے ۱۸۹۶ء میں کراچی واپس آگئے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے انجام دینا موجودہ دور میں مشکل نہ سمجھا جائے لیکن سوسال سے زیادہ عرصہ قبل ایک سولہ سالہ مسلمان نوجوان کے لئے یہ کامیابی اپنی مثال آپ تھی۔

اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد قائد اعظمؒ لندن سے کراچی پہنچے تو آپ کے خاندانی حالات انتہائی ناسازگار ہو چکے تھے چنانچہ کراچی میں کچھ عرصہ قیام کے بعد بہتر مستقبل کی تلاش میں بمبئی (حال ممبئی) منتقل ہو گئے اور وہاں اپنی اہلیت اور قابلیت کی بنیاد پر ۱۹۰۰ء میں پریذیڈنسی مجسٹریٹ کا عہدہ عارضی مدت کے لئے حاصل کر لیا حالانکہ اس زمانہ میں اس عہدہ پر کسی ہندوستانی کی تقرری بادی النظر میں ممکن نہیں تھی۔

پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی حیثیت سے قائد اعظمؒ نے اپنے فرائض منصبی اس قدر کامیابی اور خوش اسلوبی سے انجام دیئے کہ عارضی مدت ختم ہو جانے کے بعد آپ کو مستقل طور پر اس عہدہ کی پیش کش کی گئی لیکن آپ نے قبول نہیں کیا اور اپنی خداداد صلاحیتوں پر اعتماد کرتے ہوئے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کو ترجیح دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی قابلیت' اہلیت اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔

قائد اعظمؒ نے جوش' جذبات یا جلد بازی میں کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ آپ ہر فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ آپ نے ۱۹۰۶ء تک برصغیر ہند کی سیاست میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ ہندوستان کے سیاسی حالات کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کرنے کے بعد آپ نے ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا کانگریس میں شرکت کا فیصلہ کیا تاکہ ہندوستان کے تمام لوگوں کو متحد کر کے آزادی کے لئے جدوجہد کی جائے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے

قائداعظمؒ نے انتھک کوشش کی لیکن کانگریس کے منفی اور مسلم کش رویہ نے ان کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ بالآخر قائداعظمؒ کو یقین ہوگیا کہ کانگریس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ملک میں اکثریت کا راج قائم ہو اور مسلمانانِ ہند کے حقوق اور ان کے مفادات کو نظرانداز کردیا جائے۔ ۱۹۲۸ء میں پیش کردہ نہرو رپورٹ نے اس بات کا مزید ثبوت فراہم کردیا۔ قائداعظمؒ کی مناسب اور جائز ترمیمات کو یکسر نظرانداز کردیا گیا۔ غرض اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود قائداعظمؒ کانگریس کی مسلم کش پالیسی تبدیل نہ کرسکے۔ آپ کو یقین ہوگیا کہ کانگریس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اکھنڈ بھارت قائم کیا جائے جہاں اکثریت کو ہمیشہ بالادستی حاصل رہے۔

تلخ تجربات اور دل شکن مشاہدات نے قائداعظمؒ کو کانگریس کی طرف سے قطعاً مایوس کردیا اور آپ نے مجبور ہوکر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ کے تاریخی شہر میں مسلم لیگ کو فعال اور مؤثر بنانے کا بیڑا اٹھا لیا۔ آل انڈیا کانگریس قائداعظمؒ کی ذہنی صلاحیتوں اور سیاسی بصیرت سے بخوبی واقف تھی۔ اسے احساس تھا کہ جس پارٹی کی باگ ڈور قائداعظمؒ کے مضبوط ہاتھوں میں ہوگی اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ یہی سبب تھا کہ جب قائداعظمؒ نے مسلمانانِ ہند کی علیحدہ تنظیم شروع کی تو کانگریس کے ایوان میں زلزلہ آگیا اور قائداعظمؒ کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہوگیا اور شدید نکتہ چینی ہونے لگی۔ جس قائد کو مسز سروجنی نائیڈو ہندو مسلم سفیر کے لقب سے یاد کرتی تھیں اسے کانگریس نواز

حضرات اب تنگ نظر کہنے لگے۔ اسے برٹش ایجنٹ اور ہندوستان کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا گیا۔ مخالفت کرنے والوں میں وہ مسلمان بھی شامل تھے جو مصلحت بینی یا کسی اور وجہ سے کانگریس میں شامل تھے یا کسی نہ کسی صورت میں اسکی حمایت کر رہے تھے۔

ان تمام مخالفتوں، نامساعد حالات اور دشنام طرازیوں کے باوجود قائداعظمؒ آہنی عزم کے ساتھ منزل مقصود کی طرف بڑھتے رہے۔ آپ نے سیاسی حالات اور واقعات کا بخوبی اندازہ کرلیا تھا اور آپ کو یقین ہو چکا تھا کہ کانگریس سے سمجھوتہ اسی وقت ممکن ہے جب مسلمانان ہند مکمل طور پر منظم و متحد ہوں اور بساطِ سیاست کے دونوں فریق ہم پلّہ ہوں۔ کمزور فریق کی جانب سے سمجھوتہ کی کوشش عموماً لا حاصل ہوتی ہے۔

برصغیر ہند کے مسلمانوں کو منظم و متحد کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس وقت قائداعظمؒ کو نہ صرف حکومت برطانیہ سے سابقہ تھا بلکہ آپ کے خلاف ایک ایسی سیاسی جماعت نبرد آزما تھی جو زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے برتر اور طاقتور تھی۔ ان تمام دشواریوں اور رکاوٹوں کے باوجود قائداعظمؒ کی انتھک کوششوں اور ان کے عزم واستقلال نے برصغیر ہند کے مسلمانوں کو ایک پرچم تلے جمع کر دیا اور چند برسوں کی مختصر مدت میں مسلمان ایک ایسی سیسہ پلائی دیوار بن گئے جس کی طاقت سے انکار اور انحراف کسی کے لئے ممکن نہ رہا۔ جس پارٹی کے وجود سے پنڈت جواہر لال نہرو ۱۹۳۷ء میں

بابانگ دہل متکبرانہ انداز میں انکار کررہے تھے وہی پارٹی اب ایک بڑی قوت بن کر کانگریس سے نبرد آزما تھی اور انتہائی خود اعتمادی کے ساتھ اپنے عظیم رہبر، قائداعظم محمد علی جناحؒ کی ولولہ انگیز قیادت میں منزل مقصود کی جانب بڑھتی رہی اور بالآخر کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ برصغیر ہند کے بعض کانگریسی لیڈران مغربی ممالک میں زیادہ مشہور و معروف ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شہرت عظمت کی دلیل نہیں ہوتی۔ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص زیادہ مشہور ہو وہ زیادہ عظیم بھی ہو۔ کسی شخص کی حقیقی عظمت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ اسکے کردار اور اعمال کا جائزہ لیا جائے۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کسی کی عظمت کو پرکھا جاسکتا ہے۔ ایک غیر جانبدار مورّخ قائداعظمؒ کی ذاتی صفات اور آپ کے اعمال و کردار کا جائزہ لے گا تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ قائداعظمؒ برصغیر ہند کے تمام دوسرے لیڈران سے کہیں زیادہ عظیم اور برتر تھے۔ آپ کی ذہانت، دیانت، اصول پرستی، راست گوئی، سچائی اور سیاسی بصیرت اپنی مثال آپ تھی۔ آپ نے اصولوں پر کبھی سودے بازی نہیں کی، مصلحتوں پر اصولوں کو کبھی قربان نہیں کیا، قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ہمیشہ مقدم رکھا، دوست و دشمن سب آپ کی سیاسی بصیرت کے قائل تھے، ملک کے حالات اور واقعات پر آپ کی نظر اور گرفت ایسی تھی کہ آپ کی رائے گویا حرفِ آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ خودی اور خودداری قائداعظمؒ کی سرشت میں داخل تھی۔ سستی شہرت حاصل کرنے کی غرض

سے عوام کے جذبات سے کھیلنا آپ کے نزدیک انتہائی معیوب و مذموم عمل تھا۔
قائداعظمؒ کے قول و فعل میں ہمیشہ مطابقت رہی' آپ کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ برصغیر ہند کے متعدد لیڈران کی نجی زندگی عبرت انگیز اور قابل ملامت واقعات سے آلودہ نظر آتی ہے لیکن قائداعظمؒ کی نجی اور سیاسی زندگی ایک صاف و شفاف آئینہ کی طرح چمکتی دمکتی نظر آتی ہے۔

پیشہ ورانہ زندگی ہو یا سیاسی' نجی زندگی ہو یا سماجی، قائداعظمؒ کی دیانت' امانت' ذہانت' راستگوئی' اصول پرستی' ایمانداری' خوداعتمادی' خودداری اور ایسی دیگر صفات سے متعلق ایسے واقعات کثرت سے ملتے ہیں جو آپ کی عظمت پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں اور یہی وہ اعلیٰ صفات ہیں جو قائداعظمؒ کو نہ صرف برصغیر ہند کے تمام لیڈروں سے بلکہ دنیا کے بیشتر سیاسی رہنماؤں سے ممیز و ممتاز کرتے ہیں۔

سر سلطان محمد آغا خان مرحوم نے اپنی سوانح حیات میں قائداعظمؒ کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے، فرماتے ہیں:

''ان تمام سیاستدانوں میں جنہیں وہ جانتے تھے جن میں لائڈ جارج' چرچل' مہاتما گاندھی اور دیگر رہنما شامل ہیں، قائداعظمؒ سب سے زیادہ بلند پایہ تھے''۔

اس میں شک نہیں کہ اگر قائداعظمؒ کی اعلیٰ صفات اور ان کے کردار اور کارناموں کو پیش نظر رکھا جائے تو سر آغا خان مرحوم کے خیالات کی صداقت سے

کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ قائداعظمؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے تمام رکاوٹوں، مخالفتوں اور دشواریوں کے باوجود دنیا کے نقشہ پر ایک نئی سلطنت قائم کر دی۔ قائداعظمؒ یقیناً ایک عظیم رہبر تھے۔

قائداعظمؒ آج بھی زندہ ہیں!

موت کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔اس دارفانی میں جو بھی آیا ہے وہ ایک نہ ایک دن عالمِ جاودانی کو یقیناً کوچ کرے گا۔ ہر ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ہر انسان کو عدم، وجود اور فنا کی منزل سے گذرنا ہے اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا لیکن حقیقی موت وحیات کا انحصار مرنے والے کے اعمال پر ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو بڑی آسانی کے ساتھ اصولوں کو مصلحتوں پر قربان کردیتے ہیں، جن کے کردار پست اور اعمال بد ہوتے ہیں وہ زندہ رہتے ہوئے مُردوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ کچھ لوگ اعمال اور کردار کے اعتبار سے اپنی ظاہری زندگی تک زندہ رہتے ہیں لیکن بعض ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں۔

قائداعظمؒ کا شمار انہی عظیم المرتبت اور جلیل القدر ہستیوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قائداعظمؒ کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا تھا اور اس مقصد کے حصول کا آغاز اس وقت ہوا جب آپ نے برصغیر ہند کے مسلمانوں کی قیادت سنبھال کر کانگریس اور حکومت برطانیہ سے براہ راست نبرد آزمائی شروع کی۔ نہ

صرف یہ کہ قائداعظمؒ کو دو طاقتور حریفوں سے سابقہ تھا بلکہ آپ کی راہ میں بے شمار مشکلات اور دشواریاں بھی حائل تھیں۔ اُس وقت برصغیر ہند کے مسلمانوں کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ وہ ہر شعبہ زندگی میں ہندوستان کی دیگر اقوام کے مقابلہ میں پس ماندہ تھے۔ صنعت و حرفت اور تجارت میں مسلمانوں کا حصہ برائے نام تھا۔ تعلیمی اور اقتصادی حالت قابل ذکر نہ تھی' ذرائع ابلاغ پر مسلمانوں کا کوئی خاص اختیار نہ تھا۔ غرض قائداعظمؒ نے ایک ایسی قوم کی قیادت سنبھالی تھی جس کا مستقبل بظاہر تاریک تھا لیکن آپ کی سیاسی بصیرت اور حقیقت پسندانہ روش کا نتیجہ تھا کہ صرف چند برسوں میں مسلم لیگ ایک فعال جماعت بن گئی اور مسلمانوں نے ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کی صورت میں اپنی منزل مقصود "پاکستان" کا تعین بھی کر دیا۔

مارچ ۱۹۴۰ء کے بعد تحریک پاکستان دن بدن زور پکڑتی گئی۔ اسی کے ساتھ قائداعظمؒ پر کام کا دباؤ بھی بڑھتا چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی صحت خراب ہوتی چلی گئی۔ معالج مشورہ دیتے رہے اور محترمہ فاطمہ جناح اصرار کرتی رہیں کہ قائداعظمؒ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور کچھ آرام کر لیا کریں لیکن آپ نے کسی کا مشورہ قبول نہ کیا۔ ایک مرتبہ جب آپ کی ہمشیرہ نے بہت زیادہ اصرار کیا کہ اتنا زیادہ کام نہ کیا کریں۔ تو آپ نے فرمایا: "کیا تم نے سنا ہے کہ کسی جنرل نے چھٹی کی ہو جب اس کی فوج میدان جنگ میں اپنی بقا کے لئے جنگ لڑ رہی ہو؟"

قائداعظمؒ ۔کے کاندھوں پر کام کا کس قدر بوجھ تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ مسلم لیگ کے صدر ہونے کے علاوہ سنٹرل لیجسلیٹیو اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر بھی تھے۔ قائداعظمؒ ہر کام بڑی توجہ ذمہ داری اور نظم وضبط کے ساتھ انجام دینے کے عادی تھے۔اس لئے انہیں زیادہ محنت کرنی پڑتی تھی۔ ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے جب آپ بخار میں مبتلا تھے۔ اسی دوران دہلی میں لیجسلیٹو اسمبلی کا اجلاس منعقد ہونے والا تھا جس میں قائداعظمؒ کو شریک ہونا تھا۔اپنی علالت کے باوجود قائداعظمؒ بمبئی سے دہلی کے لئے روانہ ہوگئے۔ دوران سفر طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔محترمہ فاطمہ جناح نے ابتدائی طبی امداد فراہم کی لیکن افاقہ نہ ہوا۔ جب آپ دہلی پہنچے تو ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا جس نے مشورہ دیا کہ آپ کم از کم دو ہفتے مکمل آرام کریں لیکن آپ صرف دو دن آرام کرنے کے بعد اپنی اس تقریر کی تیاری میں منہمک ہوگئے جو آپ کو لیجسلیٹو اسمبلی کے اجلاس میں کرنی تھی۔اپنی شدید علالت اور ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود قائداعظمؒ نے اسمبلی کے اجلاس میں نہ صرف شرکت کی بلکہ وہاں ایک گھنٹہ تک تقریر کی جس کی وجہ سے آپ اس قدر نڈھال ہوگئے کہ گھر پہنچتے ہی بستر پر گر گئے اتنی سکت بھی نہ تھی کہ لباس تبدیل کرتے۔

اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوجود قائداعظمؒ قومی ذمہ داریوں سے کبھی غافل نہ تھے۔اپریل ۱۹۴۱ء میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کی غرض سے

قائداعظمؒ بذریعہ ریل گاڑی مدراس تشریف لے جارہے تھے۔ دوران سفر اتفاقاً اپنے کمپارٹمنٹ کے فرش پر گر پڑے جس سے کافی چوٹ آئی۔ جب گاڑی کسی اہم جنکشن پر رکی تو ڈاکٹر کو بلایا گیا جس نے مشورہ دیا کہ قائداعظمؒ کم از کم ایک ہفتہ مکمل آرام کریں۔ قائداعظمؒ اس قدر کمزور تھے کہ پہلے روز کے اجلاس میں شریک نہ ہو سکے لیکن دوسرے دن ڈاکٹر کے مشورہ کے علی الرغم اجلاس میں بھرپور شرکت کی۔ بیماری کے پے درپے حملوں کے باوجود قائداعظمؒ نے کسی کو یہ پتہ نہ ہونے دیا کہ آپ کس قدر علیل رہنے لگے تھے۔ جون ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر پٹیل نے آپ کا تفصیلی معائنہ کیا تو ایکسرے رپورٹ سے پتہ چلا کہ آپ تپ دق کے موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ اس تشویشناک انکشاف کا بھی قائداعظمؒ نے کوئی اثر نہ لیا۔ آپ نے انتہائی سکون واطمینان کے ساتھ ایکسرے رپورٹ لے کر اپنی تجوری میں مقفل کر دی اور ڈاکٹر پٹیل سے عہد لیا کہ وہ اس رپورٹ کو صیغہ راز میں رکھیں گے۔ ڈاکٹر پٹیل کا ہم پر احسان ہے کہ انہوں نے قائداعظمؒ کی مہلک بیماری کو پاکستان کے قیام سے قبل کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا ورنہ پاکستان شاید کبھی عالم وجود میں نہ آتا۔ حکومت برطانیہ اور کانگریسی لیڈران بڑی آسانی کے ساتھ سیاسی مذاکرات کو طول دے دیتے خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ حکومتِ برطانیہ نے جون ۱۹۴۸ء تک اقتدار منتقل کرنے کے لئے اپنے کو پابند کیا تھا اور جون ۱۹۴۸ء تک قائداعظمؒ کی صحت قطعی جواب دے چکی ہوتی اور آپ اس قابل نہ رہ جاتے کہ مذکرات کر سکیں یا پاکستان کے قیام کے لئے جدوجہد جاری رکھ سکیں۔

پاکستان کے قیام کے بعد قائداعظمؒ کی صحت تیزی کے ساتھ گرتی چلی گئی۔ حکومت ہند کی ریشہ دوانیوں' سازشوں اور بدعہدیوں کا قائداعظمؒ کے دل و دماغ پر اور بھی برا اثر پڑا۔ ملکی اثاثہ کی غیر منصفانہ تقسیم' کشمیر کا ہندوستان سے جبراً الحاق، بے گناہ مسلمانوں کا بے دریغ قتلِ عام اور اسی قسم کے دوسرے واقعات نے قائداعظمؒ کے دل کا سکون چھین لیا تھا اور آپ کی صحت روز بروز گرتی چلی گئی۔

قائداعظمؒ کو اپنی زندگی کی قطعاً پرواہ نہ تھی۔ پاکستان کی بقا اور اس کا استحکام ہی آپ کے لئے سب کچھ تھا۔ پاکستان کو جو مسائل درپیش تھے ان سے آپ بخوبی واقف تھے اور خرابی صحت کے باوجود انہیں حل کرنے کی ہر امکانی کوشش کرتے تھے۔ ہندوستان سے خستہ حال مہاجرین لٹ پٹ کر پاکستان آ رہے تھے۔ ان کی آبادکاری کے لئے جو اقدامات کئے جا رہے تھے ان کا جائزہ لینے کے لئے قائداعظمؒ ستمبر ۱۹۴۷ء میں بہ نفس نفیس لاہور تشریف لے گئے۔ عوام سے کئے گئے وعدہ کا بھی آپ کو بڑا پاس تھا۔ صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں مسلم لیگ کی شاندار کامیابی پر آپ نے وعدہ کیا تھا کہ سرحد کے عوام کا شکریہ ادا کرنے کے لئے آپ خود پشاور جائیں گے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۴۸ء میں آپ سرحد تشریف لے گئے اور وہاں مختلف جلسوں سے خطاب کیا۔ پشاور میں ایک جلسہ سے قائداعظمؒ خطاب فرما رہے تھے کہ بوندا باندی شروع ہو گئی لیکن آپ جلسہ کے اختتام تک بیٹھے رہے۔ بارش میں بھیگ جانے کے باعث آپ بخار

میں مبتلا ہو گئے۔ کراچی واپس آنے کے بعد کئی روز تک صاحب فراموش رہے۔ رفتہ رفتہ طبیعت سنبھلنے لگی لیکن کمزوری بدستور قائم رہی۔ محترمہ فاطمہ جناح اور اپنے معالج کے اصرار پر تبدیلی آب وہوا اور آرام کی غرض سے کوئٹہ منتقل ہونے پر راضی ہو گئے۔ کوئٹہ میں قیام کے دوران آپ کی صحت اس حد تک بحال ہو گئی کہ آپ نے وہاں کئی جلسوں سے خطاب فرمایا، لیکن صحت کی بحالی دیرپا ثابت نہ ہوئی اور آپ کی صحت پھر خراب ہونے لگی۔

یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو کراچی میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی رسم افتتاح قائد اعظمؒ کے دست مبارک سے انجام پائی تھی۔ آپ کی تشویشناک حالت کے پیش نظر محترمہ فاطمہ جناح اور قائد اعظمؒ کے ADC نے مشورہ دیا کہ آپ کراچی تشریف نہ لے جائیں لیکن آپ نے اپنے وعدہ کے مطابق اسٹیٹ بینک کی رسم افتتاح میں شرکت کی۔ کراچی سے واپسی پر آپ کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی اور کمزوری اس حد تک بڑھ گئی کہ آپ کے لئے ممکن نہ رہا کہ کسی تقریب میں شرکت کر سکیں۔ چنانچہ آپ نے فیصلہ کیا کہ کوئٹہ سے زیارت منتقل ہو جائیں اور وہاں رہ کر اپنا علاج کرائیں۔ زیارت میں ڈاکٹر الٰہی بخش کو طلب کیا گیا۔ چوبیس جولائی کو ڈاکٹر صاحب نے قائد اعظمؒ کا تفصیلی معائنہ کیا۔ علالت کی نوعیت معلوم کرنے کیلئے مختلف ٹیسٹ ہوئے۔ ایکسرے کی رپورٹ سے پتہ چلا کہ قائد اعظمؒ کے پھیپھڑے بہت زیادہ خراب ہو چکے ہیں۔ قائد اعظمؒ کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ نو اگست ۱۹۴۸ء کو معالجوں

نے فیصلہ کیا کہ آپ کو کوئٹہ منتقل کر دیا جائے۔

کوئٹہ پہنچنے کے بعد قائداعظمؒ کی طبیعت اس حد تک سنبھل گئی کہ ڈاکٹروں نے دن میں ایک گھنٹہ کام کرنے کی آپ کو اجازت دے دی لیکن یہ صورت حال عارضی ثابت ہوئی۔ آپ کی حالت پھر بگڑنے لگی۔ خود قائداعظمؒ اپنی زندگی سے مایوس نظر آنے لگے تھے پانچ ستمبر کو قائداعظمؒ کے پھیپھڑوں میں شدید انفیکشن ہو گیا جس کی وجہ سے اگلے چند دنوں میں آپ کی حالت انتہائی تشویشناک ہو گئی چنانچہ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ آپ کو فوراً کراچی منتقل کیا جائے۔ اس فیصلہ سے جب قائداعظمؒ کو آگاہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا: "ہاں مجھے کراچی لے چلئے میں وہاں پیدا ہوا تھا اور وہیں دفن ہونا چاہتا ہوں"۔

ستمبر کی دس تاریخ تھی جب ڈاکٹر الٰہی بخش نے محترمہ فاطمہ جناح کو یہ اندوہناک خبر سنائی کہ قائدِ اعظمؒ صرف چند دنوں کے مہمان ہیں۔ گیارہ ستمبر کی شام کو تقریباً سوا چار بجے قائداعظمؒ کا وائیکنگ ہوائی جہاز ماری پور کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ قائداعظمؒ کا اسٹریچر فوجی ایمبولینس میں رکھا گیا۔ محترمہ فاطمہ جناح اور نرس (سسٹر ڈنہام) اسی ایمبولنس میں بیٹھ گئیں۔ شومیٔ قسمت ایمبولنس کچھ دور چلنے کے بعد خراب ہو گئی۔ ایک گھنٹہ تک ڈرائیور ایمبولنس ٹھیک کرتا رہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ایک دوسری ایمبولنس منگوائی گئی جو تقریباً ۶ بج کر ۱۰ منٹ پر پہنچی۔ اسی ایمبولنس میں قائداعظمؒ کو گورنر جنرل ہاؤس لے جایا گیا۔ آپ کی حالت بگڑتی چلی گئی اور بالآخر اسی رات برصغیر ہند کے مسلمانوں کا یہ بیباک

تاریخ ساز اور عظیم قائد اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔ قائداعظمؒ گیارہ ستمبر کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہم سے رخصت ہو گئے لیکن جب ہم آپ کے بلند کردار اور کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ قائداعظمؒ ہماری رہنمائی کے لئے آج بھی زندہ ہیں۔

قائداعظمؒ ایک تاریخ ساز شخصیت

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ عالمی سطح کے ماہر قانون دان اور عظیم المرتبت سیاسی رہنما تھے۔ اپنے زمانے کے ایک کامیاب بیرسٹر کی حیثیت سے آپ نے بڑے اہم اور پیچیدہ مقدمات کی پیروی کی جن میں سر فیروز شاہ مہتہ اور بال گنگا دھر تلک کے مشہور مقدمات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بعض مقدمات میں قائداعظمؒ کی کامیابی قانون دانی سے زیادہ ان کی ذہانت و فطانت کا نتیجہ تھی۔ اسی نوع کے ایک مقدمہ کی تفصیل عرصہ ہوا جناب جسٹس (ریٹائرڈ) قدیر الدین صاحب نے علامہ اقبال ٹاؤن کراچی کی بزمِ اقبال کی ایک نشست میں بیان کی تھی جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

''پاکستان کے قیام سے بہت پہلے کی بات ہے کہ دوسری شادی کر لینے پر ایک مطلقہ مسلم خاتون کے سابق شوہر نے مقدمہ دائر کر دیا کہ شادی عدت کی مدت ختم ہونے سے چند روز پہلے انجام پائی ہے۔ مدعی نے اپنے مقدمہ کی پیروی کسی مشہور وکیل کے سپرد کی جبکہ مدعا علیہ خاتون نے قائداعظمؒ کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ مدعی

کے وکیل نے مقدمہ کی تیاری میں روز و شب ایک کر دیئے اور مقدمہ کی تاریخ پر قانونی کتابوں کا ایک انبار ساتھ لے کر عدالت پہنچے۔ قائداعظمؒ بظاہر خالی ہاتھ تشریف لائے۔ مقدمہ کی کاروئی شروع ہوئی۔ کمرہ عدالت حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مدعی کے وکیل نے اپنی دانست میں بڑے مضبوط دلائل پیش کئے اور کافی دیر تک بحث کی۔ فاضل وکیل کو اپنی کامیابی کا یقین تھا لیکن موصوف کی امیدیں خاک میں مل گئیں جب قائداعظمؒ نے انتہائی مختصر وقت میں اپنے دلائل مؤثر طور پر پیش کر کے مقدمہ جیت لیا۔ آپ کا موقف تھا کہ مدعی کے وکیل نے عدت کی مدت کا تعین عیسوی کلنڈر کے حساب سے کیا ہے اسی لئے انہیں غلط فہمی ہوئی کہ میری مؤکلہ نے عدت کی مدت ختم ہونے سے چند روز قبل دوسری شادی کی ہے۔ اگر موصوف ہجری کیلنڈر پیش نظر رکھتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ شادی مدت عدت کے بعد عمل میں آئی ہے''۔

قائداعظمؒ کی پیشہ ورانہ زندگی میں متعدد ایسے واقعات ہیں جو آپ کی قانونی صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں۔

قائد اعظمؒ نہ صرف ایک قانون دان بلکہ ایک بلند پایہ اور صاحب کردار سیاست دان کی حیثیت سے بھی عالمی شہرت کے مالک ہیں۔ آپ نے سیاست کے میدان میں اس وقت تک قدم نہیں رکھا جب تک

آپ نے اپنی مالی حالت کو مضبوط او مستحکم نہیں بنالیا اور خود اپنا ایک نام اور مقام پیدا نہیں کرلیا۔آپ کی سیاست بڑی صاف ستھری اور بے داغ تھی۔ آپ نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی اور نہ کوئی ایسا قدم اٹھایا جو غیر مستحسن ہو۔آپ ہمیشہ دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں اپنا موقف پیش کرتے تھے۔اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے کسی کو فریب دینا آپ کے مزاج کے خلاف تھا۔قائداعظمؒ کی سیاسی بصیرت اس قدر ارفع و اعلیٰ تھی کہ برصغیر پاک و ہند کا کوئی دوسرا لیڈر آپ کا ہم پلہ نہیں ہوسکتا۔آپ انتہائی نڈر اور بیباک تھے۔حق گوئی 'ایمانداری اور دیانتداری آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی آپ ثابت قدم رہے۔

آپ کی پیشہ ورانہ اور سیاسی زندگی میں بہت سے واقعات ایسے ملیں گے جو آپ کی حق پسندی اور دیانتداری کی نشاندہی کرتے ہیں۔ان میں سے ایک واقعہ ۱۹۴۶ء کے آغاز میں بنگال لیجسلیٹو اسمبلی سے تعلق رکھتا ہے۔مسلم چیمبر آف کامرس کلکتہ کی نشست کے لئے مرزا ابوالحسن اصفہانی صاحب امیدوار تھے۔کاغذاتِ نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ سے چند روز قبل خلافِ توقع ایک اور امیدوار نے بھی کاغذات نامزدگی داخل کردیئے اور بعض مسلم لیگی رہنماؤں کی کوششوں کے باوجود دستبردار ہونے پر تیار نہیں ہو رہے تھے۔یہاں تک کہ کاغذات نامزدگی واپس لینے کی تاریخ ختم ہوگئی۔اصفہانی صاحب کے عزیز دوست

عبد الرحمٰن صدیقی صاحب نے پھر بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں بالآخر مد مقابل امیدوار دستبردار ہونے پر رضامند ہو گئے مگر شرط یہ رکھی کہ زرِضمانت مبلغ دوسو پچاس روپے جس کی واپسی کے امکانات اب ختم ہو چکے تھے اصفہانی صاحب انہیں دے دیں تا کہ موصوف مالی نقصان سے بچ جائیں۔ یہ مطالبہ بظاہر غیر معقول نہ تھا چنانچہ صدیقی صاحب خوشی کے عالم میں اصفہانی صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے اور انہیں مژدہ سنایا۔اس وقت وہاں قائد اعظمؒ بھی موجود تھے۔قبل اس کے کہ اصفہانی صاحب جواب دیتے قائداعظمؒ نے صدیقی صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''رقم دی جائے؟ ایک امیدوار کو دستبردار ہونے کے لئے گویا رشوت دی جائے؟ نہیں کبھی نہیں۔ان سے فوراً کہہ دیجئے کہ ان کی پیش کش مسترد کر دی گئی ہے۔حسن ان سے انتخاب لڑیں گے۔''

یہ واقعہ اصفہانی صاحب نے قائداعظمؒ سے متعلق اپنی کتاب ''QUAID-E-AZAM AS I KNOW HIM'' میں بیان کیا ہے۔

اصفہانی صاحب کے حق میں انتخاب سے دستبرداری کی جو شرط ان کے مدمقابل نے رکھی تھی وہ بادی النظر میں ممکن ہے کہ غیر معقول نہ ہو کیونکہ کاغذات نامزدگی واپس لینے کی آخری تاریخ نکل جانے کے بعد زرضمانت کی واپسی ممکن نہیں تھی اور مقابلہ سے دستبرداری کی صورت میں امیدوار کو زرضمانت سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ ان حالات میں اپنی پوزیشن کو مستحکم بنانے کے لئے

اصفہانی صاحب اپنے مدمقابل کی پیش کش قبول کر لیتے تو قابل اعتراض بات نہ ہوتی لیکن قائداعظمؒ کی بلند بینی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اس شرط کو بھی منظور کرنا گوارا نہ کیا۔

اس میں شک نہیں کہ قائداعظمؒ بلند کردار اور صالح اعمال کے مالک تھے۔آپ کی ہر بات میں ایک عجیب شان تھی۔آپ کی عظمت اور آپ کے عزم وحوصلہ کا اندازہ ان الفاظ سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو آپ اپنے بیانات اور تقریروں میں بعض اوقات استعمال کرتے تھے۔

اکیس اگست ۱۹۴۵ء کو اس وقت کے وائسرائے ہند لاڈ ویول نے جب انتخاب منعقد کرانے کا اعلان کیا تو مسلم لیگ نے بھی تیاریاں شروع کر دیں لیکن انتخابی مہم کو جاری رکھنے اور اسے مؤثر بنانے کیلئے کثیر سرمایہ کی ضرورت تھی۔قائداعظمؒ نے الیکشن فنڈ میں چندہ کیلئے اپیل کرتے ہوئے فرمایا:

''ہمیں نقرئی گولیاں دیجئے اور ہم کام تمام کر دیں گے''

"GIVE US THE SILVER BULLETS AND WE WILL FINISH THE JOB"

قائداعظمؒ نے انتہائی نامساعد اور مشکل حالات میں کانگریسی لیڈران اور آخری وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور سیاسی بدعنوانیوں کے باوجود پاکستان قائم کر کے برصغیر کے مسلمانوں پر جو احسان عظیم

کیا ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ قائد اعظمؒ کی انتھک کوششوں' کاوشوں اور پرخلوص جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اپنے آزاد اور خودمختار ملک پاکستان میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قائداعظمؒ جیسا تاریخ ساز رہنما کسی ملک و قوم کو صدیوں میں نصیب ہوتا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

قائدِ اعظمؒ اور گورنر جنرل کا عہدہ

''یادِ رفتگان'' سے ماخوذ ستمبر ۱۹۹۵ء کے ماہنامہ لامیر میں شائع ہونے والے ایک مضمون ''قائداعظم جینارحمتہ اللہ علیہ'' میں قائداعظمؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''............ان کی نسبت ان کے دوست اور دشمن ایک بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہ کبھی حکومت وقت سے ڈرے اور نہ جاہ و منصب کی کوئی حرص وطمع ان کو اپنی جگہ سے ہلا سکی............''

یہ ایک مشہور عالم ہندوستانی دانشور کے ارشادات ہیں جو حقیقت پر مبنی ہیں لیکن کس قدر افسوس اور تعجب کی بات ہے کہ خود ہمارے ملک میں اس کے برخلاف بعض حضرات بانئ پاکستان پر مختلف نوعیت کے بے بنیاد الزامات عائد کرتے رہتے ہیں حالانکہ اپنے وطن یا اس کے بانی کو مطعون کرنا کوئی احسن عمل نہیں ہے۔ جس درخت کے سایہ میں انسان بیٹھا ہو اس کی شاخوں کو قطع کرنا عاقبت نااندیشی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

قائداعظمؒ پر جو الزامات عائد کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک الزام یہ ہے کہ آپ کی تمام سیاسی جدوجہد کا مقصد صرف یہ تھا کہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بن جائیں۔ تحریکِ پاکستان، قائداعظمؒ اور ان کی سیاسی بصیرت سے واقف ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ یہ الزام قطعاً بے بنیاد ہے۔ منفی طرزِ فکر اختیار کرنا بہت آسان ہے۔ اس قسم کے الزامات لگانے والے ملک وملت سے نہ تو کوئی لگاؤ رکھتے ہیں اور نہ تاریخی حقائق سے آگہی۔ ایسی الزام تراشیاں عموماً لاعلمی اور کوتاہ نظری کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔

تعصب وتنگ نظری کی بات الگ ہے ورنہ صاحبانِ علم ودانش بخوبی واقف ہیں کہ گاندھی جی نے پیش کش کی تھی کہ اگر قائداعظمؒ مطالبۂ پاکستان سے دست بردار ہو جائیں تو انہیں متحدہ ہندوستان کا وزیراعظم تسلیم کر لیا جائے گا۔ قائداعظمؒ کو جاہ ومنصب کی طلب یا طمع ہوتی تو آپ مطالبۂ پاکستان کو پسِ پشت ڈال کر وزیراعظم یا گورنر جنرل بن جاتے لیکن جاہ ومنصب آپ کا مطمع نہ تھا۔ قائداعظمؒ سیاسی افق پر بلندی کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے کہ اعلیٰ ترین عہدہ آپ کی عزت وعظمت میں اضافہ کا سبب نہیں بن سکتا تھا البتہ قائداعظمؒ جس عہدے کو قبول کرتے خود اسی میں چار چاند لگ جاتے۔ آپ کا مدعا صرف یہ تھا کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد اور خودمختار مملکت قائم کی جائے۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ الزام کہ قائداعظمؒ کی سیاسی جدوجہد کا مقصد پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کا عہدہ حاصل کرنا تھا انتہائی شرانگیز ہے۔

اختلاف رائے رکھنا ہر شخص کا بنیادی حق اور جمہوریت کا تقاضہ ہے لیکن ایسے الزامات عائد کرنا جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو، نادانی اور تنگ نظری کے سوا کچھ نہیں۔ ہر شخص واقف ہے کہ بعض ہستیاں اپنے کارناموں کی وجہ سے اتنی بلند و بالا ہو جاتی ہیں کہ جاہ و منصب، ان کی عزت و عظمت میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ تقسیم ہند کے وقت گاندھی جی کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز نہیں تھے اس کے باوجود ان کے معتقدین آج بھی انہیں مہاتما گاندھی کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ قائداعظمؒ کا مرتبہ تو درحقیقت گاندھی جی سے بھی بلند تھا۔ آپ نے گاندھی جی کی انتہائی مخالفت کے باوجود پاکستان کو وجود میں لا کر ایک ایسا تاریخی کارنامہ انجام دیا جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ آپ کی نگاہوں میں گورنر جنرل کے عہدہ کی کیا حقیقت ہو سکتی تھی۔

تقسیم ہند کے پس منظر کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ گورنر جنرل پاکستان کے عہدہ کو قبول کرنا قائداعظمؒ کا ایک انتہائی دانشمندانہ فعل تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ پنڈت نہرو اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کے سخت ترین مخالفین میں سے تھے۔ ان دونوں کی دلی خواہش اور کوشش تھی کہ پاکستان وجود میں نہ آئے لیکن جب کامیابی نہ ہوئی اور پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا تو اسے نقصان پہنچانے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے ریڈ کلف (RADCLIFFE) کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ایوارڈ کو اس طرح تبدیل کر دیں کہ ہندوستان کو ریاست جموں و کشمیر جانے کا

راستہ میسر آ جائے۔ ایک منصوبہ یہ بھی تیار کیا گیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بیک وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں مملکتوں کے گورنر جنرل بن جائیں۔ بادی النظر میں یہ ایک بے ضرر منصوبہ تھا لیکن حقیقتاً اس کا مقصد یہ تھا کہ سفارتی اور بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی اہمیت اور وقار کو کم کیا جائے اور غیر ممالک کو یہ تاثر دیا جائے کہ پاکستان ایک آزاد اور خودمختار مملکت نہیں بلکہ ہندوستان ہی کی ایک ذیلی ریاست ہے۔ کانگریسی لیڈران اس منصوبہ کے رموز سے پوری طرح واقف تھے۔ قائداعظمؒ کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور کانگریسی لیڈروں کے ناپاک عزائم کا خوب اندازہ تھا۔ آپ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہرگز یہ موقع نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ بیک وقت ہندوستان اور پاکستان کے مشترکہ گورنر جنرل بن کر دنیا کو یہ غلط اور گمراہ کن تاثر دیں کہ پاکستان صحیح معنوں میں آزاد اور خودمختار مملکت نہیں ہے چنانچہ قائداعظمؒ نے فیصلہ کیا کہ پاکستان کا گورنر جنرل ایک پاکستانی ہوگا۔ یہ برمحل، بروقت اور انتہائی دانشمندانہ فیصلہ قائداعظمؒ کی فقید المثال بصیرت کا ایک اور ثبوت تھا۔ اس فیصلہ سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی یہ آرزو کہ وہ پاکستان کے بھی گورنر جنرل بن جائیں خاک میں مل گئی اور وہ کف افسوس ملتے رہ گئے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے آخری وائسرائے مقرر ہونے سے قبل بھی بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے۔ ہندوستان میں بہ سلسلہ انتقال اقتدار انہوں نے جو خدمات انجام دی تھیں اس کی وجہ سے ان کی شہرت میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ پاکستان کو نقصان پہنچا کر انہوں نے جو فائدے ہندوستان کو

فراہم کئے تھے اس کے صلہ میں کانگریسی لیڈران نے انہیں بہ رضا و رغبت ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل بنا کر ان کی شہرت کو" چار چاند" لگا دیئے تھے۔ اس صورت حال کے پیش نظر سوال یہ تھا کہ کس پاکستانی کو پاکستان کا گورنر جنرل بنایا جائے جو عالمی سطح پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ہم پلہ ہو؟

بین الاقوامی سطح پر قائد اعظمؒ مشہور و معروف شخصیت تھے۔ وقت کا تقاضا یہی تھا کہ پاکستان میں بھی گورنر جنرل کے عہدے پر ایک ایسا ہی شخص فائز ہو جو عالمی شہرت یافتہ ہو۔ یہی سبب تھا کہ اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کے تمام سرکردہ لیڈران کی نگاہوں میں پاکستان کے گورنر جنرل کے عہدہ کیلئے قائد اعظمؒ سے زیادہ موزوں کوئی دوسری ہستی موجود نہ تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملانے اور پاکستان کو بین الاقوامی سطح پر ایک آزاد اور خود مختار حیثیت سے روشناس کرانے کیلئے انتہائی ضروری تھا کہ قائد اعظمؒ پاکستان کے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھال لیں۔ اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن پاکستان کے گورنر جنرل بن جاتے تو وہ پاکستان کو مزید نقصان پہنچاتے اور ممکن تھا کہ ان کی سازشوں کے نتیجہ میں پاکستان کا وجود ہی خطرہ میں پڑ جاتا۔

یہ تھا وہ پس منظر جو قائد اعظمؒ کے گورنر جنرل ہونے کا سبب بنا۔ ان تمام حقائق کے باوجود اگر کہا جائے کہ قائد اعظمؒ کی سیاسی جدوجہد کا مقصد یہ تھا کہ وہ گورنر جنرل کے عہدہ پر فائز ہو جائیں تو یہ ایک ایسا منفی اندازِ فکر ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

قائداعظمؒ ایک فقید المثال رہنما

صداقت، دیانت، راست گوئی اور بلند بینی قائد اعظمؒ کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ ان کے قول و فعل میں تضاد نہ تھا۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ وہ ہمیشہ دوٹوک بات کرنے کے عادی تھے اور اپنے موقف کا اظہار کھل کر کرتے تھے۔ سیاسی حریفوں کو انہوں نے کبھی دھوکے میں نہیں رکھا اور نہ مقصد کے حصول کے لئے ہتھکنڈوں سے کام لیا۔ قائد اعظمؒ کی سیاسی زندگی میں متعدد ایسے واقعات پیش آئے جب مطلب برآری کے لئے آپ وہی حکمت عملی اختیار کر سکتے تھے جو دوسرے سیاسی رہنما ایسے موقعوں پر اختیار کر لیتے ہیں لیکن انہوں نے کسی حال میں بھی حق و صداقت کا دامن نہیں چھوڑا۔

ہر سیاسی لیڈر کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی پارٹی الیکشن میں زیادہ سے زیادہ نشستیں حاصل کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے بعض اوقات بدعنوانیوں سے بھی گریز نہیں کیا جاتا اور اگر امکان نظر آئے تو کوشش کی جاتی ہے کہ مخالف امیدوار مقابلہ سے دست کش ہو جائے۔ قائد اعظمؒ اس قسم کی تمام بدعنوانیوں کے سخت مخالف تھے۔ وہ ہمیشہ ایک صاف ستھرے اور شفاف الیکشن

کے حامی تھے۔ کامیابی کے لئے بدعنوانی کا ارتکاب انہیں ہرگز گوارا نہ تھا۔

۱۹۴۶ء کے اوائل کی بات ہے جب بنگال لیجسلیٹو اسمبلی (CENTRAL LEGISLATIVE ASSEMBLY) کے انتخابات عمل میں آرہے تھے۔ مرزا ابوالحسن اصفہانی صاحب مسلم چیمبر آف کامرس کلکتہ کی نشست کے لئے امیدوار تھے۔ عام خیال تھا کہ کوئی دوسرا امیدوار مقابلہ پر نہ آئے گا لیکن خلاف توقع کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ سے دو روز قبل چیمبر کے ایک ممبر نے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کر دیئے اور کسی طرح مقابلہ سے کنارہ کش ہونے پر راضی نہ ہوا یہاں تک کہ کاغذاتِ نامزدگی واپس لینے کی آخری تاریخ گذر گئی۔ اصفہانی صاحب کے ایک عزیز دوست عبدالرحمٰن صدیقی صاحب نے پھر بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اسی زمانہ میں قائداعظمؒ کلکتہ تشریف لائے ہوئے تھے اور اصفہانی صاحب کے یہاں قیام پذیر تھے۔ ایک دن شام کے وقت اصفہانی صاحب جب قائداعظمؒ کے ساتھ اپنے بنگلہ پر پہنچے تو صدیقی صاحب بھی آگئے اور مژدہ سنایا کہ مخالف امیدوار الیکشن سے دستبردار ہونے پر تیار ہے بشرطیکہ زرِضمانت کی رقم مبلغ دوسو پچاس روپے اسے دے دیئے جائیں۔ بادی النظر میں یہ شرط غیر معقول نہ تھی کیونکہ کاغذات نامزدگی واپس لینے کی تاریخ نکل چکی تھی اور اب زرِضمانت کی واپسی کا کوئی امکان نہ تھا۔ اسی لئے صدیقی صاحب کا خیال تھا کہ امیدوار کی شرط منظور کر لی جائے گی لیکن قبل اس کے کہ اصفہانی صاحب کوئی جواب دیتے قائداعظمؒ بولے:

زرِ ضمانت کی رقم دی جائے ؟ گویا ایک امیدوار کو مقابلہ سے دستبردار ہونے کے لئے رشوت دی جائے ؟ نہیں کبھی نہیں۔ ان سے فوراً جا کر کہہ دیجئے کہ پیش کش مسترد کر دی گئی"

اور پھر اصفہانی صاحب سے مخاطب ہو کر آپ نے فرمایا:

"سیاسی زندگی میں اعلیٰ اقدار کی پابندی زیادہ ضروری ہے۔ سیاسی زندگی میں اگر کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اس کا اثر ان تمام افراد پر پڑتا ہے جنہیں تم پر اعتماد ہے"۔

کوئی اور سیاسی لیڈر ہوتا تو موقع سے فائدہ اٹھاتا اور مخالف امیدوار کی پیش کش بخوشی قبول کر لیتا لیکن قائداعظمؒ ایسی کسی بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے جو بلند کردار اور اعلیٰ اقدار کے منافی ہو۔ الیکشن ہوئے اور جب نتائج کا اعلان ہوا تو پتہ چلا کہ مخالف امیدوار کو ایک ووٹ بھی نہیں ملا۔ اگر مخالف امیدوار کی شرط مان لی جاتی تو ممکن تھا کہ نتائج کے اعلان کے بعد مخالفین یہ کہتے ہوئے نظر آتے کہ اصفہانی صاحب کی کامیابی اس امیدوار کی رہین منت ہے جو مقابلہ سے دستبردار ہو گیا۔ خود وہ امیدوار بھی ڈینگ مار سکتا تھا کہ اگر میں مقابلہ سے دستبردار نہ ہوتا تو اصفہانی صاحب کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ قائداعظمؒ کی دور بیں نگاہیں ان امکانات کو دیکھ رہی تھیں اسی لئے وہ اصفہانی صاحب کے حق میں ایک ایسی کامیابی کے خواہاں تھے جو انتہائی شفاف ہو اور جس کی اہمیت کو ان کے مخالفین کسی اعتبار سے کم نہ کر سکیں۔

قائداعظمؒ نے کبھی اصولوں پر سودے بازی نہیں کی۔ غیر معقول اور اوچھے طریقوں سے کام نکالنا ان کی سرشت میں نہ تھا۔ انہوں نے کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو پست ذہنیت کا آئینہ دار ہو۔ اپنی ذات کو بھی انہوں نے ہمیشہ اعلیٰ اقدار کا تابع رکھا۔ **سنٹرل لیجسلیٹیو اسمبلی کی مسلم نشست کیلئے** قائداعظمؒ موجودہ ممبئی شہر سے امیدوار تھے۔ صالح بھائی اور حسین بھائی لالجی دوسرے امیدوار تھے۔ صالح بھائی کو جب اپنی کشتی ڈوبتی نظر آئی تو قائداعظمؒ سے التجا کی کہ وہ صالح بھائی کو الیکشن سے دستبردار ہونے کا مشورہ دیں کہ اس طرح انہیں (صالح بھائی کو) مقابلہ سے باعزت طور پر کنارہ کش ہونے کا ایک جواز مل جائے۔ صالح بھائی کا مقصد دراصل یہ تھا کہ ان کی متوقع شکست حقیقت بن کر منظر عام پر نہ آنے پائے۔ قائداعظمؒ کا جواب تھا کہ یہ میرا کام نہیں کہ مقابلہ سے دستبردار ہونے کا مشورہ دوں۔ صالح بھائی بخوشی آخر وقت تک مقابلہ کر سکتے ہیں مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ صالح بھائی الیکشن سے بہر حال ازخود دستبردار ہو گئے۔

حسین بھائی لالجی کو بھی یقین تھا کہ ذلت آمیز شکست ان کا مقدر بن چکی ہے اسی لئے اپنا بھرم قائم رکھنے کیلئے انہوں نے بھی قائداعظمؒ سے درخواست کی کہ الیکشن سے کنارہ کش ہونے کیلئے کہہ دیں۔ قائداعظمؒ کا جواب وہی تھا جو وہ صالح بھائی کو دے چکے تھے۔ حسین بھائی لالجی مقابلہ سے دستبردار تو نہ ہوئے لیکن جب نتائج کا اعلان ہوا تو قائداعظمؒ بھاری اکثریت سے کامیاب

قرار پائے۔

ایک اور واقعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قائداعظمؒ اعلیٰ اقدار کی پاسداری اور پابندی بہت سختی کے ساتھ کرتے تھے۔ ۱۹۴۶ء انتخابی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کیلئے قائداعظمؒ نے سندھ کا دورہ کیا۔ صوبائی مسلم لیگ کے ایک وفد نے ان سے ملاقات کی اور انتخابی مہم کو کامیابی کے ساتھ چلانے میں درپیش مالی مشکلات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔ قائداعظمؒ نے وفد کی باتیں غور سے سنیں۔ دریافت کیا کہ کتنی رقم درکار ہوگی؟ وفد نے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کیا۔ قائداعظمؒ نے پچاس ہزار روپے دیئے اور فرمایا:

''یہ نہ سمجھئے گا کہ میں آپ سے کوئی سودا کر رہا ہوں۔ فی الوقت میری دسترس میں یہی کچھ ہے جو میں دے سکتا ہوں''

پھر آپ نے زور دے کر کئی مرتبہ کہا:

''میں چاہتا ہوں کہ ہر مسلم نشست پر کامیابی حاصل کی جائے''۔

لیکن آخری بات جو کہی وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ نے فرمایا:

''میں چاہتا ہوں کہ ہر ایک مسلم نشست پر کامیابی حاصل کی جائے لیکن یاد رکھئے کبھی بے ایمانی سے کام نہ لیجئے گا۔ میں دھوکہ دہی کے مقابلہ میں شکست خوردگی کو ترجیح دوں گا''۔

قائداعظمؒ کی زندگی میں لاتعداد واقعات ایسے ہیں جن کی تفصیل بیان

کی جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ مختصر سے مضمون میں انہیں سمیٹنا ممکن نہیں۔ ان کی صداقت ودیانت ہر صاحب فکر ونظر تسلیم کرتا ہے۔ قائداعظمؒ کی سیاسی بصیرت، حق گوئی، دور اندیشی، بلند بینی، بلند نظری، اعلیٰ ظرفی و اعلیٰ اقدار کی پاسداری کو پیش نظر رکھا جائے تو بلاشبہ قائداعظمؒ نہ صرف ہندوستان و پاکستان بلکہ عالمی سطح کے ایک فقید المثال رہبر تھے۔

قائداعظمؒ کی دانشمندی، ماؤنٹ بیٹن پاکستان کے گورنر جنرل نہ بن سکے

دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ میں الیکشن ہوئے تو لیبر پارٹی (LABOUR PARTY) کے مقابلہ میں برسراقتدار کنزرویٹو پارٹی (CONSERVATIVE PARTY) کو شکست ہوگئی۔ سرونسٹن چرچل کی جگہ لیبر پارٹی کے سربراہ کلیمنٹ ایٹلی (CLEMENT ATTLEE) برطانیہ کے وزیراعظم منتخب ہوگئے۔ لیبر پارٹی کی کامیابی پر ہندوستان میں کانگریسی لیڈران بہت خوش تھے اس کا سبب یہ تھا کہ لیبر پارٹی کو آل انڈیا کانگریس سے بڑی ہمدردی تھی چنانچہ کانگریسی لیڈران کو یقین تھا کہ انتقال اقتدار کے وقت لیبر پارٹی سے انہیں سیاسی فائدے ضرور حاصل ہوں گے۔ ان کے یہ اندازے درست ثابت ہوئے۔ عنان حکومت سنبھالنے کے بعد کلیمنٹ ایٹلی

نے سب سے پہلے ایک ایسی انتظامی تبدیلی کی جو آل انڈیا کانگریس کی مرضی ومنشا کے مطابق تھی۔

لیبر پارٹی کے اقتدار میں آنے سے قبل لارڈ ویول (Lord Wavell) وائسرائے ہند اپنے فرائض منصبی حتی الامکان غیر جانبداری سے انجام دے رہے تھے لیکن یہ صورتحال کانگریس کے سیاسی مفادات کے لئے سازگار نہ تھی۔ حکومت برطانیہ بھی اسی وجہ سے ان کی کارکردگی سے غیر مطمئن تھی چنانچہ اصولی طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ لارڈ ویول کی جگہ کسی دوسری مناسب شخصیت کو وائسرائے ہند مقرر کیا جائے۔ اس سلسلہ میں سر اسٹیفورڈ کرپس (SIR STAFFORD CRIPPS) نے ہندوستان کی ایک مشہور و معروف شخصیت کرشنا مَنن (KRISHNA MENON) سے گفتگو کی جو اس وقت لندن میں موجود تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن (LORD LOUIS MOUNTBATTEN) کا نام تجویز کر دیا۔ سر اسٹیفورڈ کرپس نے کرشنا مَنن کی رائے سے اتفاق کیا لیکن دونوں میں طے پایا کہ اس بات کو صیغۂ راز میں رکھا جائے تاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کو پتہ نہ چلنے پائے کہ وائسرائے ہند کی تقرری کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا نام کرشنا مَنن نے تجویز کیا ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا نام وائسرائے ہند کے لئے برطانوی وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی کو پیش کیا گیا تو انہوں نے فوراً منظور کر لیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت جواہر لال نہرو آپس میں گہرے

دوست تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کی اہلیہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے بھی پنڈت نہرو سے قریبی مراسم تھے۔ ہندوستان کے ایک مشہور صحافی ایم۔ جے۔ اکبر نے پنڈت نہرو پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں پنڈت نہرو اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے متعلق ایسے واقعات تحریر کئے ہیں جو ان دونوں کے قریبی دوستانہ مراسم کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ہمدردیاں آل انڈیا کانگریس کے ساتھ تھیں اور وہ فطری طور پر پنڈت نہرو کو زیادہ سے زیادہ سیاسی فائدے پہنچانا چاہتے تھے۔

آل انڈیا کانگریس قیام پاکستان کے خلاف تھی چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سب سے پہلے متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر اقتدار منتقل کرنے کا جائزہ لیا لیکن جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو اصولی طور پر یہی طے پایا کہ مطالبہ پاکستان کو تسلیم کرلیا جائے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور بعض کانگریسی لیڈران اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ پاکستان وجود میں آنے کے بعد تھوڑے عرصہ میں ختم ہو جائے گا۔ لیری کولنس (LARRY COLLINS) اور ڈومینک لیپر (DOMINQUE LAPIERRE) اپنی کتاب ''فریڈم ایٹ مڈنائٹ'' (FREEDOM AT MID=NIGHT) میں لکھتے ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن کا خیال تھا کہ جب پاکستان بنیادی طور پر یکسر ناقابل عمل ہے تو اسے ایک موقع ضرور دیا جائے تاکہ اپنے وجود میں آنے کے بعد وہ خود ہی ختم ہو جائے۔ اسی کتاب میں سردار ولبھ بھائی پٹیل کی لن ترانیوں کا بھی ذکر

ہے۔ انہوں نے تحقیر آمیز انداز میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار اس طرح کیا:

''جناح کو ان کی سلطنت دے دو۔ وہ بہر حال قائم نہ رہ سکے گی۔ پانچ سال کے اندر مسلم لیگ ہمارے دروازہ پر دستک دیتی ہوئی ہندوستان سے الحاق کے لئے بھیک مانگتی ہوئی نظر آئے گی۔''

بہر حال جب یہ طے پایا گیا کہ ہندوستان کا سیاسی تصفیہ تقسیم ہند کی بنیاد پر ہوگا تو اس مقصد کے حصول کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے برق رفتاری سے کام شروع کر دیا اور اقتدار منتقل کرنے کی حتمی تاریخ چودہ اگست ۱۹۴۷ء مقرر کر دی حالانکہ تیس جون ۱۹۴۸ء تک انہیں اس کے لئے اختیار حاصل تھا۔ یہ پہلا قدم تھا جو ماؤنٹ بیٹن نے قیام پاکستان کی راہ میں مشکلات پیدا کرنے کے لئے اٹھایا لیکن ان کی یہ حکمت عملی پاکستان کیلئے رحمت بن گئی۔ اگر اقتدار چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو منتقل نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ پاکستان کا قیام ہی خطرے میں پڑ جاتا کیونکہ جون ۱۹۴۸ء تک قائداعظمؒ کی صحت اس قابل نہ رہ جاتی کہ وہ اپنی منزل مقصود حاصل کر پاتے۔ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے علم میں یہ بات آئی کہ قائداعظمؒ ۱۹۴۶ء سے تپ دق کے مرض میں مبتلا تھے تو انہوں نے اعتراف کیا کہ اگر یہ بات انہیں انتقال اقتدار سے قبل معلوم ہو جاتی تو وہ تقسیم ہند کا فیصلہ کرنے میں عجلت سے کام نہ لیتے۔

پاکستان کو نقصان پہنچانے کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ ہندوستان کے بعض مسلم اکثریتی صوبوں کے علاقے جہاں غیر مسلم

اکثریت میں تھے انہیں ہندوستان میں شامل کر دیا۔ اسکے لئے جواز یہ پیش کیا گیا کہ جن اصولوں کے تحت ہندوستان کی تقسیم کی جارہی ہے اسکا منطقی تقاضہ ہے کہ پنجاب، بنگال اور آسام کے صوبوں کی کاٹ چھانٹ کی جائے۔ اس طرح ان تینوں صوبوں کے بہت بڑے علاقے ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے۔ ان میں بعض وہ علاقے بھی شامل تھے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔

پاکستان کو مزید مشکلات میں الجھانے کی غرض سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سیاسی بد دیانتی کا ایک اور ثبوت پیش کیا۔ وہ اس طرح کہ سر ریڈ کلف (SIR CYRIL RADCLIFFE) پر دباؤ ڈال کر ضلع گرداس پور جو مسلم اکثریتی علاقہ تھا مشرقی پنجاب میں شامل کرالیا تاکہ جموں وکشمیر جانے کے لئے ہندوستان کو ایک ایسی راہ گزر میسر آجائے جو ہر موسم میں بغیر کسی دشواری کے استعمال کی جاسکے۔

ریاست جموں وکشمیر کا ہندوستان سے الحاق پاکستان کے خلاف دراصل ایک گہری سازش تھی۔ ریاست حیدر آباد کا ہندوستان سے الحاق بزور شمشیر کیا گیا تو منطق یہ پیش کی گئی کہ چونکہ ریاست کی اکثریت غیر مسلم ہے اس لئے اسکے فرمانروا کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ پاکستان سے الحاق کرے یا ریاست کو آزاد اور خودمختار رکھے۔ اسی منطق کی بنیاد پر ہندوستان نے جوناگڑھ کی ریاست پر بھی زبردستی قبضہ کرلیا حالانکہ اسکا الحاق باقاعدہ اور باضابطہ طور پر پاکستان سے ہو چکا تھا۔ ریاست جموں وکشمیر میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی اسکے باوجود

ہندوستان نے وہ منطق جو حیدر آباد اور جونا گڑھ کی ریاستوں پر تسلط جمانے کے لئے پیش کی تھی اسے جموں و کشمیر کی ریاست کے معاملے میں یکسر نظر انداز کر دیا اور سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سرپرستی میں انتہائی چالبازی اور چابک دستی سے کام لیتے ہوئے حکومت ہند نے اسے بھی غصب کر لیا۔

پاکستان کے حصہ کی رقم کی ادائیگی اور اثاثوں کی تقسیم کے سلسلے میں حکومت ہند نے جو بدعنوانیاں اور بے ضابطگیاں روا رکھیں وہ بھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے علم میں تھیں لیکن ان کے ازالہ کے لئے انہوں نے کوئی قابل ذکر کردار ادا نہیں کیا۔ انتقال اقتدار کے ضمن میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جو فائدے ہندوستان کو بہم پہنچائے اس کے صلہ میں کانگریس نے انہیں ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کر دیا۔ بعد میں گورنر جنرل کی حیثیت سے بھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان سے اپنی وفاداری اور پنڈت نہرو سے اپنی دیرینہ دوستی کا حق ادا کرتے رہے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ بیک وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں مملکتوں کے گورنر جنرل بن جائیں لیکن قائداعظمؒ کی دور بینی اور دانشمندی نے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی کیونکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی نیت کا انہیں خوب اندازہ تھا۔ اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن پاکستان کے گورنر جنرل بن جاتے تو عجب نہ تھا کہ وہ اپنے عہدہ کی معیاد ختم ہونے تک سردار ولبھ بھائی پٹیل کی خواہش کے مطابق پاکستان کے وجود ہی کو ختم کر کے رکھ دیتے۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ

چند دلچسپ واقعات

تحریک پاکستان کا زمانہ تھا قائداعظمؒ احمد آباد (گجرات) تشریف لے گئے۔ وہاں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک مقامی لیڈر نے آپ سے ملاقات کی اور دورانِ گفتگو قائداعظمؒ کو بتایا کہ کانگریس کے حامی طلبہ طعنہ دیتے ہیں کہ جناح صاحب فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہیں اور کوپے (COUPE) کی دونوں نشستیں اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں جبکہ گاندھی جی تیسرے درجہ کے کمپارٹمنٹ میں صرف ایک نشست لے کر سفر کرتے ہیں۔ اس اعتراض کا جواب دینے سے ہم مسلمان طلبا عاجز ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مخالفین کو کیونکر مطمئن کریں۔

یہ سن کر قائداعظمؒ مسکرائے اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی دولت

دی ہے کہ میں مسلمانانِ ہند کے لیڈر کی حیثیت سے فرسٹ کلاس میں سفر کر سکتا ہوں۔ گاندھی تیسرے درجہ میں ضرور سفر کرتے ہیں لیکن پورا کمپارٹمنٹ جس میں کم وبیش چالیس نشستیں ہوتی ہیں ان کے اور ان کے ساتھیوں کے لئے مخصوص کردیا جاتا ہے۔ ان کے اخراجات سفر میرے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتے ہیں مزید برآں گاندھی کے یہ اخراجات آل انڈیا کانگریس برداشت کرتی ہے جبکہ اپنے سفر کے اخراجات میں خود برداشت کرتا ہوں۔

طالب علم نے پھر سوال کیا۔ جناب والا! آپ کوپے (COUPE) کی دونوں نشستیں اپنے لئے کیوں مخصوص کر لیتے ہیں جبکہ کوئی دوسرا فرد آپ کے ساتھ نہیں ہوتا۔

قائداعظمؒ نے فرمایا:

"میرے نوجوان! میں اس بات کی وضاحت کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس خیال سے کہ تمہیں اپنے مخالفین کو جواب دینے میں آسانی ہو اسکی وجہ تمہیں بتاتا ہوں۔ میں ایک مرتبہ بذریعہ ٹرین سفر کر رہا تھا۔ کوپے میں میرے لئے ایک نشست مخصوص تھی جبکہ دوسری نشست خالی تھی۔ کسی اسٹیشن پر گاڑی رکی تو ایک دیدہ زیب کپڑوں میں ملبوس ایک اینگلو انڈین لڑکی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئی۔ غالباً اس کے پاس دوسری نشست کا ریزرویشن تھا۔ ٹرین روانہ ہوئی۔ میں اپنی فائلیں دیکھنے میں منہمک تھا۔ اچانک اس لڑکی

نے کہا: دیکھئے مسٹر جناح! مجھے پانچ سو روپے عنایت کر دیجئے ورنہ میں زنجیر کھینچ کر ٹرین گارڈ سے شکایت کر دوں گی کہ آپ نے میرے ساتھ دست درازی کی کوشش کی ہے۔ اپنے اعصاب پر مکمل قابو رکھتے ہوئے میں اپنی فائلیں دیکھنے میں بدستور مصروف رہا جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ دوسری مرتبہ پھر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے جب لڑکی نے اپنا مطالبہ دہرایا تو میں نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ میں قوت سماعت سے قطعاً محروم ہوں۔ لکھ کر بتایئے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ لڑکی نے فوراً اپنا مدعا لکھ کر میرے حوالہ کر دیا۔ جیسے ہی لڑکی کی تحریر میرے ہاتھ میں آئی میں نے اٹھ کر زنجیر کھینچ لی۔ گاڑی رکی۔ گارڈ آیا تو میں نے لڑکی کی تحریر اس کے حوالہ کی اور اسے ہدایت کی کہ لڑکی کو کمپارٹمنٹ سے باہر لے جائے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن کہ میں فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی دونوں نشستیں اپنے لئے ریزرو کرا کے سفر کرتا ہوں"۔

اس واقعہ کو ہمارے ملک کے ممتاز دانشور سید ہاشم رضا صاحب نے پاکستان بحریہ کے اسٹاف کالج میں دو نومبر ۱۹۸۶ء کو ایک تقریر میں بیان کیا تھا۔ اس تقریر کے اقتباسات کموڈور (ریٹائرڈ) طارق مجید صاحب نے اپنے مضمون میں تحریر کئے ہیں جو کالج کے ایک مجلہ میں شائع ہو چکا ہے۔

قائداعظمؒ کی ذہانت اور حاضر دماغی ان کی پیشہ ورانہ زندگی میں بھی نمایاں تھیں۔ اس ضمن میں ایک واقعہ جسٹس قدیرالدین صاحب نے عرصہ ہوا بزم اقبال (علامہ اقبال نارتھ ناظم آباد ٹاؤن کراچی) کی ایک نشست میں بیان کیا تھا جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔ پاکستان کے قیام سے بہت پہلے کی بات ہے کہ ایک شخص نے اپنی مطلقہ بیوی کے خلاف مقدمہ دائر کردیا کہ خاتون نے دوسری شادی عدت کی مدت ختم ہونے سے چند روز قبل کرلی۔ مقدمہ کی پیروی کے لئے مدعی نے ایک مشہور ومعروف وکیل کی خدمات حاصل کیں اور مدعاعلیہ خاتون نے قائداعظمؒ کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ مدعی کے وکیل مقدمہ کی زبردست تیاری کرتے رہے لیکن قائداعظمؒ بظاہر کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ خاتون اس صورت حال سے فکرمند رہتی تھیں۔ قائداعظمؒ سے جب ملاقات ہوتی تو مناسب الفاظ میں مدعی کے وکیل کی تیاریوں کا ذکر بھی کرتیں گویا ان کو بتانا چاہتی تھیں کہ وہ بھی اپنے مقدمہ پر توجہ دیں لیکن ہمت نہ پڑتی تھی کہ اپنا مدعا صاف صاف بیان کریں۔ آخرکار مقدمہ کی تاریخ آن پہنچی۔ مدعی کے وکیل اپنے ساتھ قانونی کتابوں کا ایک انبار لئے عدالت کے کمرہ میں داخل ہوئے جبکہ قائداعظمؒ خالی ہاتھ تھے۔ مقدمہ کی کاروائی شروع ہوئی۔ کمرۂ عدالت کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ مدعی کے وکیل نے زبردست بحث کی۔ اپنی دانست میں بڑے ٹھوس اور مضبوط دلائل پیش کئے۔ مدعی اور ان کے فاضل وکیل کو یقین تھا کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوجائے گا لیکن تمام امیدیں خاک میں مل گئیں جب

قائداعظمؒ نے بحث کا آغاز کیا۔آپ نے فرمایا:

''یہ قطعاً غلط ہے کہ میری مؤکلہ نے عدت کی مدت ختم ہونے سے چند روز قبل شادی کی ہے۔مدعی کے فاضل وکیل نے عدت کی مدت کا تعین دراصل عیسوی کیلنڈر کے حساب سے کیا ہے۔اگر موصوف ہجری کیلنڈر پیش نظر رکھتے تو انہیں معلوم ہوجاتا کہ شادی عدت کی مدت ختم ہونے کے بعد عمل میں آئی تھی''۔

قائداعظمؒ کی مدلل اور جامع بحث کے نتیجے میں مقدمہ کا فیصلہ خاتون کے حق میں ہوگیا۔

اسی نوع کے واقعات ان کتابوں میں بھی محفوظ ہیں جو قائداعظمؒ کے متعلق لکھی جاچکی ہیں۔ہیکٹر بولیتھو (HECTOR BOLITHO) نے اپنی کتاب ''JINNAH CREATOR OF PAKISTAN'' میں تحریر کیا ہے کہ ایک مرتبہ قائداعظمؒ کسی عدالت میں بحث کررہے تھے۔بحث کے دوران جج نے انہیں ٹوکا: مسٹر جناح! آپ کسی تیسرے درجہ کے مجسٹریٹ سے مخاطب نہیں ہیں۔قائداعظمؒ نے برجستہ جواب دیا: مائی لارڈ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو متنبہ کروں کہ آپ کسی تیسرے درجہ کے وکیل سے مخاطب نہیں ہیں۔اسی قسم کا ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب کسی عدالت میں جج نے قائداعظمؒ سے تحکمانہ لہجے میں کہا: مسٹر جناح! بلند آواز میں بحث کیجئے مجھے آپ کی آواز سنائی نہیں دیتی۔قائداعظمؒ نے جواب دیا: میں بیرسٹر ہوں ایکٹر نہیں۔تھوڑی دیر بعد

جج نے پھر کہا: میں آپ سے کہہ رہا ہوں زور سے بولئے۔ قائداعظمؒ نے جواب دیا: اگر آپ اپنے سامنے سے کتابوں کا انبار ہٹادیں تو میں جو کچھ کہہ رہا ہوں آپ بخوبی سن سکیں گے۔

اپنے پیشہ میں قائداعظمؒ نے ہمیشہ دیانتداری اور راست گوئی سے کام لیا۔ بمبئی (حال ممبئی) کے ایک مشہور تاجر حاجی عبدالکریم کو کسی سنگین الزام میں پیش ہونا تھا۔ وہ جناح صاحب کو اپنا وکیل مقرر کرنا چاہتے تھے۔ جناح صاحب سے فیس دریافت کی تو انہوں نے پانچ سو روپے یومیہ بتائی۔ حاجی صاحب کہنے لگے: اس وقت میرے پاس کل پانچ ہزار روپے ہیں اسی کو قبول کر کے مقدمہ کی پیروی مکمل کر دیں۔ جناح صاحب نے کہا: میری فیس پانچ سو روپے یومیہ ہوگی اگر منظور ہے تو مجھے وکیل کیجئے ورنہ کسی اور کی خدمات حاصل کر لیجئے۔ حاجی صاحب نے مسٹر جناح کی شرط مان کر انہیں اپنا وکیل مقرر کر لیا۔ قائداعظمؒ نے یہ مقدمہ تین روز میں جیت لیا۔ پانچ سو روپے یومیہ کے حساب سے صرف پندرہ سو روپے فیس لی۔ کسی اضافی رقم کا مطالبہ نہیں کیا۔

قائداعظمؒ اصول اور ضابطہ کے منافی کوئی بات پسند نہ کرتے تھے۔ خصوصاً جب اس کی وجہ سے حق تلفی ہو رہی ہو۔ ۱۹۰۳ء کا واقعہ ہے کوئی اہم مقدمہ بمبئی (حال ممبئی) ہائی کورٹ میں زیر سماعت تھا۔ مقدمہ کی کاروائی دیکھنے کے لئے لوگ کثیر تعداد میں آئے تھے۔ عدالت میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مجبوراً دروازے بند کرنا پڑے۔ جناح صاحب پہنچے تو ان کے لئے جگہ نہ تھی۔ عدالت

میں ایک حصہ وکلا کے لئے مخصوص تھا۔اس میں بھی کوئی نشست خالی نہ تھی۔ اتفاقاً جناح صاحب کی نظر بمبئی میونسپل کارپوریشن کے پریزیڈنٹ جیمز میکڈونالڈ (JAMES MACDONALD) پر پڑی جو وکیلوں کے لئے مخصوص احاطہ میں ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ان کا شمار کسی اعتبار سے وکلا کے زمرہ میں نہ تھا۔ چنانچہ جناح صاحب نے ان سے نشست خالی کرنے کے لئے کہا لیکن وہ رضامند نہ ہوئے۔مجبوراً جناح صاحب عدالت کے اہلکار کے پاس گئے اور اسے ہدایت کی کہ مسٹر میکڈونالڈ سے نشست خالی کرائے۔اہلکار نے پس وپیش کیا تو قائداعظمؒ نے کہا: اگر مسٹر میکڈونالڈ کو ہٹایا نہ گیا تو وہ جج سے اپنا مدعا بیان کریں گے۔اہلکار کے لئے اب کوئی چارہ کار نہ تھا بجز اس کے کہ مسٹر جناح کے لئے نشست خالی کرائے۔ جب اس نے میکڈونالڈ سے جا کر کہا تو انہوں نے خاموشی سے نشست چھوڑ دی۔

بڑی ناانصافی ہوگی اگر اس موقع پر مسٹر میکڈونالڈ کی اعلیٰ ظرفی اور بلند بینی کی تعریف نہ کی جائے۔انہوں نے کسی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ مسٹر جناح کے طرزِ عمل سے بہت متاثر ہوئے۔اس وقت تک مسٹر میکڈونالڈ ان سے واقف بھی نہ تھے۔باہر آ کر ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور کچھ عرصہ بعد مسٹر جناح کو ایک ہزار روپے ماہانہ مشاہرہ پر بمبئی میونسپل کارپوریشن کے مقدمات کی پیروی کے لئے متعین کر دیا۔

معمولی سی بے ضابطگی بھی قائداعظمؒ کے مزاج کے خلاف تھی۔ایک

مرتبہ کسی مقدمہ میں ان کے مدمقابل ایم۔اے۔سوم جی وکیل تھے جو بعد میں بمبئی ہائی کورٹ کے جج ہوئے۔اس مقدمہ میں پیشی کے لئے اچانک پکار ہوگئی۔مسٹر سوم جی اس وقت دوسری عدالت میں ایک مقدمہ کی پیروی کررہے تھے۔انہوں نے جناح صاحب کو کہلوایا کہ ان کے مقدمہ کی کاروائی مختصر عرصہ کے لئے ملتوی کردی جائے۔جب مسٹر جناح راضی نہ ہوئے تو متعلقہ جج سے درخواست کی گئی۔انہوں نے جواب دیا: اگر مسٹر جناح رضامند ہوں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔جب مسٹر جناح سے کہا گیا تو انہوں نے انکار کردیا۔کہنے لگے میرے فاضل دوست سوم جی کو اس صورت حال کے امکان کو پیش نظر رکھنا چاہئے تھا اور اصولی طور پر ان کو لازم تھا کہ التوا کے لئے مجھ سے براہ راست درخواست کرتے۔غور کیا جائے تو جناح صاحب کا موقف اصولی طور پر بالکل درست تھا۔

قائداعظمؒ کی پیشہ ورانہ زندگی میں ایسے واقعات بھی ہیں جب انہوں نے بلافیس مقدمہ کی پیروی کی۔ایک مرتبہ کوئی مقدمہ اُن کے سپرد کیا گیا۔مؤکل کے مالی وسائل محدود تھے لیکن مسٹر جناح پیروی کے لئے تیار ہوگئے۔اُنہوں نے مقدمہ کی تیاری حسب عادت بڑی محنت کی۔اسکے باوجود فیصلہ اُن کے مؤکل کے خلاف ہوا۔پھر بھی مسٹر جناح کو قوی امید تھی کہ اپیل میں کامیابی ہوجائے گی۔لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مؤکل کے پاس مزید اخراجات کیلئے رقم نہ تھی۔مسٹر جناح نے اس مشکل کو یوں حل کیا کہ جس شخص کے توسط سے مؤکل آیا تھا

اس پر زور دیا کہ اپیل کے ابتدائی ضروری اخراجات وہ برداشت کریں جبکہ مسٹر جناح بغیر کسی فیس کے مقدمہ کی پیروی کردیں گے۔اپیل دائر ہوئی۔ مقدمہ کا فیصلہ مؤکل کے حق میں ہوگیا۔ اس کامیابی سے خوش ہوکر مؤکل نے فیس کی پیش کش کی۔ مسٹر جناح نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔فرمایا: میں نے بلامعاوضہ پیروی کی تھی۔اب کوئی فیس قبول نہیں کروں گا۔

ہیکٹر بولیتھو نے اسی نوع کا ایک اور واقعہ اپنی کتاب ''JINNAH CREATOR OF PAKISTAN'' میں تحریر کیا ہے کہ قائداعظمؒ کا ایک مؤکل ان کی کارکردگی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں سے اس قدر خوش و مطمئن ہوا کہ اس نے طے شدہ فیس سے زیادہ رقم پیش کی لیکن آپ نے اضافی رقم واپس کردی۔اس قسم کے اور واقعات بھی کتاب میں مذکور ہیں۔

ان واقعات سے قائداعظمؒ کی ذہانت' حاضر دماغی' حاضر جوابی' خود اعتمادی' دیانت داری' راست گوئی اور اصول پسندی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔یہی وہ صفات ہیں جو قائداعظمؒ کی شخصیت کو بلند و بالا کرتی ہیں۔

راجہ صاحب محمود آباد،
چند یادیں چند باتیں

میرے بڑے بھائی سید کلب مصطفیٰ صاحب ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لکھنؤ کے راجہ صاحب محمود آباد کے قریبی مراسم تھے۔ علم و ادب سے باہمی دلچسپی اور سیاسی خیالات و نظریات کی ہم آہنگی نے ان مراسم کو مزید مستحکم بنا دیا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں تحریک پاکستان اپنے شباب پر تھی اور ایک بڑے نازک دور سے گذر رہی تھی۔ الیکشن میں مسلم لیگ کی کامیابی کے لئے راجہ صاحب محمود آباد نے تن من دھن کی بازی لگا رکھی تھی اور اس زمانہ میں اپنی گوناگوں سیاسی مصروفیات کی بنا پر لکھنؤ میں آپ کا قیام کم رہتا تھا لیکن راجہ صاحب جب بھی لکھنؤ میں موجود ہوتے کلب مصطفیٰ صاحب ان سے عموماً ضرور ملاقات کرتے۔ ایک رات راجہ صاحب محمود آباد سے ملاقات کے بعد کلب مصطفیٰ صاحب گھر واپس آئے تو اپنی میز کی دراز سے کچھ کاغذات نکال کر ایک لفافہ میں بند کئے اور مجھے ہدایت کی کہ

میں وہ لفافہ محمود آباد ہاؤس جا کر راجہ صاحب کو پہنچادوں۔ ساتھ ہی تاکید کی کہ لفافہ خود راجہ صاحب کے حوالہ کروں۔

محمود آباد ہاؤس ہمارے گھر سے دور نہ تھا۔ چنانچہ میں لفافہ لے کر وہاں پہنچا۔ اس وقت رات کے تقریباً نو بجے تھے۔ استقبالیہ پر ایک صاحب موجود ملے۔ ان سے میں نے اپنا تعارف کرایا اور آنے کا مقصد بیان کیا۔ موصوف اندر گئے اور واپس آکر مجھ سے کہا ''تشریف لے چلئے۔ سرکار منتظر ہیں''۔ میں کمرہ میں داخل ہوا۔ یہ کھانے کا کمرہ تھا' میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی راجہ صاحب لفافہ لینے کے لئے بڑھے۔ میں نے سلام کرنے کے بعد انہیں لفافہ پیش کیا۔ راجہ صاحب نے میرے ہاتھ سے لفافہ لے لیا اور فرمانے لگے: ''میاں! کھانا لگا ہوا ہے۔ آپ کھانا کھا کر جایئے گا''۔ شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے عرض کیا کہ کھانا کھا چکا ہوں۔ چند لمحوں بعد راجہ صاحب سے رخصت ہو کر واپس گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راجہ صاحب کے اخلاق واعلیٰ کردار' ان کی علم دوستی وادب نوازی' ان کی بلند بینی وبلند نظری اور دیگر خوبیوں کے متعلق میں بہت کچھ سن چکا تھا لیکن اس سے قبل ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا تھا۔ راجہ صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ میں ان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوا۔

پاکستان کے قیام کے بعد ۱۹۴۸ء میں ہجرت کر کے میں سابقہ مشرقی پاکستان چلا گیا اور وہاں جنوری ۱۹۵۱ء میں نیشنل بینک آف پاکستان سے منسلک ہو گیا۔ ۱۹۵۳ء میں میرا تبادلہ مغربی پاکستان ہو گیا۔ کراچی سمیت

مغربی پاکستان کے مختلف شہروں میں تعیناتی کے بعد بالآخر میرا تبادلہ مئی ۱۹۶۵ء میں ایک مرتبہ پھر کراچی ہوگیا۔اس تمام عرصہ میں راجہ صاحب محمود آباد سے دوبارہ نیاز حاصل نہ ہوسکا لیکن اسی سال ایک ایسا سانحہ پیش آیا جو راجہ صاحب سے ملاقات کا سبب بن گیا۔ ۲۸ نومبر ۱۹۶۵ء کو برادر محترم کلب مصطفیٰ صاحب کا حرکت قلب بند ہوجانے سے لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔مرحوم کے ایصال ثواب کیلئے میں نے امام بارگاہ رضویہ سوسائٹی میں قرآن خوانی ومجلس کا اہتمام کیا۔اس زمانہ میں میرا مستقر کراچی ضرور تھا لیکن میں عموماً دورہ پر رہتا تھا اسلئے میرے لئے ممکن نہ تھا کہ کراچی میں موجود جملہ عزیزوں' دوستوں اور کرم فرماؤں کو قرآن خوانی ومجلس کیلئے بذاتِ خود مدعو کرتا چنانچہ یہ کام میں نے اپنے بھانجے سید مسعود الحسنین سلمہ کے سپرد کردیا اور انہیں خاص طور پر ہدایت کی کہ خود راجہ صاحب کی رہائش گاہ پر جاکر قرآن خوانی ومجلس کا رقعہ ضرور پہنچادیں۔مقررہ تاریخ پر حسب پروگرام صبح نو بجے قرآن خوانی شروع ہوئی۔ میں امام بارگاہ کے چبوترے پر قرآن خوانی میں شرکت کیلئے آنے والے بعض حضرات سے گفتگو کررہا تھا اتنے میں راجہ صاحب محمود آباد اپنی کار خود چلاتے ہوئے امام بارگاہ کے احاطہ میں داخل ہوئے۔قرآن پاک ہاتھ میں لئے ہوئے کار سے نیچے اترے۔میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔راجہ صاحب نے اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں مجھ سے تعزیت کی اور میرے ہمراہ امام بارگاہ کے ہال میں داخل ہوئے اور پھر بیٹھ کر کلام پاک کی تلاوت کرنے لگے۔تلاوت ختم کرنے کے بعد مجھ سے معذرت کی کہ مجلس میں

شریک نہ ہوسکیں گے کیونکہ ان کے کسی قریبی عزیز کا اسی روز آپریشن ہونا تھا۔ میں نے راجہ صاحب کا شکریہ ادا کیا اور انہیں بصد احترام رخصت کیا اور وہ اپنی کار میں واپس روانہ ہو گئے۔ کلفٹن میں واقع اپنی رہائش گاہ سے خود کار چلا کر رضویہ سوسائٹی کے امام بارگاہ آنا اور وہ بھی ایسے وقت میں جبکہ اسی دن چند گھنٹوں بعد اپنے قریبی عزیز کا آپریشن ہونے والا ہو راجہ صاحب محمود آباد کی رواداری' شرافت نفس' حسن اخلاق' شفقت و محبت اور انسان دوستی کا آئینہ دار تھا۔ راجہ صاحب محمود آباد سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔

اور پھر غالباً ۱۹۶٦ء میں یہ خبر نظر سے گزری کہ ایک مرکزی وزیر، راجہ صاحب کی رہائش گاہ پر ان کی عیادت کے لئے گئے جو کچھ عرصہ سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ اس خبر کو پڑھنے کے بعد میں راجہ صاحب کی عیادت کے لئے گیا۔ اپنے آنے کی اطلاع دی۔ فوراً بلالیا۔ راجہ صاحب اس وقت بستر علالت پر دراز تھے۔ چہرے پر نقاہت کے آثار نمایاں تھے۔ سلام کرنے کے بعد میں ان کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ جب میں نے بتایا کہ مجھے علالت کا علم اخبار سے ہوا تو مسکرا کر فرمایا: ''میاں! وہ تو میں منسٹر صاحب کی وجہ سے اخبار میں چھپ گیا''۔ اس جملہ میں کتنا طنز کتنی بذلہ سنجی' سادگی اور درویشی پنہاں تھی اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو راجہ صاحب کے مزاج اور ان کی شخصیت سے واقف ہو۔ راجہ صاحب سے یہ میری تیسری اور آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد پھر ان سے ملنا نصیب نہ ہوا یہاں تک کہ چودہ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو یہ خبر آئی

کہ راجہ صاحب محمود آباد کا لندن میں انتقال ہو گیا۔ یہ خبر کیا تھی ایک کوہ الم تھا جو راجہ صاحب کے عقیدت مندوں' مداحوں اور رشتہ داروں پر ٹوٹ پڑا۔ اس خبر نے ہر اس شخص کو جو راجہ صاحب سے واقف تھا ملول و غمزدہ کر دیا۔ لوگ بجا طور پر محسوس کر رہے تھے کہ!

ایک عالی دماغ تھا نہ رہا

راجہ صاحب محمود آباد کے ایصال ثواب کیلئے ایک مجلس ان کی رہائشگاہ پر منعقد ہوئی جس میں میرے بھانجے مسعود الحسنین سلمہ اور میں نے بھی شرکت کی۔ راجہ صاحب محمود آباد کی یاد میں مختلف انجمنوں اور اداروں کی جانب سے بھی قرآن خوانی' مجالس اور تعزیتی جلسوں کا اہتمام ہوتا رہا۔ ایک مجلس رضویہ سوسائٹی کے امام بارگاہ میں منعقد کی گئی۔ حاضرین میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب، مولانا جمال الدین عبدالوہب صاحب فرنگی محلی (عرف جمال میاں صاحب فرنگی محلی)، مختار زمن صاحب اور دیگر ممتاز شخصیتیں موجود تھیں۔ مجلس سے قبل متعدد مقررین نے راجہ صاحب کو خراج تحسین پیش کیا۔ ان مقررین میں جناب مختار زمن صاحب بھی شامل تھے۔ آپ نے راجہ صاحب کے بلند کردار اور صالح اعمال پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ایک مرتبہ جب وہ لندن آئے تو راجہ صاحب سے بھی ملنے گئے۔ وہاں ان کی ملاقات پہلے راجہ صاحب کی سیکریٹری سے ہوئی۔ باتوں باتوں میں سیکریٹری نے مختار زمن صاحب سے کہا: ''آپ کے راجہ صاحب بڑے عجیب وغریب آدمی ہیں جب ٹیلیفون کا ذاتی استعمال

کرتے ہیں تو مجھ سے کہتے ہیں کہ میں نوٹ کرلوں کہ وہ ان کی ذاتی کال تھی''۔
دیانتداری اور ایمانداری کی یہ اعلیٰ اور نادر مثال ہم سب کے لئے قابل تقلید ہے۔ راجہ صاحب کی انسان دوستی اور رحمدلی کا بھی ایک واقعہ مختار زمن صاحب نے بیان کیا جو کچھ اس طرح تھا کہ لندن میں ایک روز مختار زمن صاحب راجہ صاحب کے پاس بیٹھے تھے کہ ان کی سیکریٹری بھی آ گئی۔ راجہ صاحب نے دریافت کیا کہ وہ کل کیوں نہیں آئیں؟ سیکریٹری نے جواب دیا ''جناب کل میری طبیعت خراب تھی''۔ یہ جواب سن کر راجہ صاحب نے اس سے کہا تو آج بھی نہ آتیں سیکریٹری کو گمان ہوا کہ راجہ صاحب شاید ناراضگی کا اظہار فرما رہے ہیں چنانچہ اس نے کہا میری طبیعت زیادہ خراب تھی ورنہ کل غیر حاضر نہ ہوتی'' راجہ صاحب نے کہا ''نہیں نہیں۔ میرا یہ مطلب ہے کہ آپ آج بھی آرام کر لیتیں، اب آپ جا کر آرام کریں''۔ سیکریٹری جانے کیلئے اٹھی تو راجہ صاحب نے اس سے کہا ''بیٹھیے۔ کافی پی کر جایئے گا''۔ راجہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے کافی بنائی اور بڑی شفقت کے ساتھ اُسے پیش کی۔ راجہ صاحب کے اخلاق سے وہ اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار اسکی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

راجہ صاحب ایک درویش صفت انسان تھے۔ ان کی انسان دوستی، شرافت، اصول پرستی، رواداری، اسلام دوستی، علم نوازی اور کردار کی بلندی اظہر من الشمس تھی۔ کون نہیں جانتا کہ پاکستان کیلئے آپ نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا لیکن پاکستان سے خود کبھی کوئی فائدہ نہ حاصل کیا۔ آپ کی خدمت کے

اعتراف میں انہیں متعدد بار اعلیٰ عہدوں کی پیشکش کی گئی لیکن آپ نے قبول نہ کیا۔ صدر ایوب کے دور میں جب راجہ صاحب محمود آباد سے کنونشن مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کے لئے درخواست کی گئی تو آپ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا حالانکہ بعض مقتدر حضرات نے موقع سے خوب فائدے حاصل کئے اور اس طرح اصولوں کو مصلحتوں پر قربان کرنے سے باز نہ آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ راجہ صاحب محمود آباد جیسی ہستی اور ان جیسا با اصول، بے لوث اور مخلص لیڈر مشکل ہی سے قوم کو نصیب ہوتا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا سیاسی کردار
تقسیم ہند کے حوالے سے

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے آخری وائسرائے کی حیثیت سے اپنے فرائض غیر جانبداری کے ساتھ انجام نہیں دیئے تھے اور تقسیم ہند کے موقع پر کانگریس کی بھرپور مدد کی تھی۔ حد یہ ہے کہ انہوں نے باؤنڈری کمیشن کے چیرمین سر سیرل ریڈ کلف (SIR CYRIL RADCLIFF) کو مجبور کیا کہ وہ پنجاب کی سرحدوں سے متعلق بعض فیصلے ہندوستان کے حق میں تبدیل کر دیں۔ اس واقعہ کی تفصیل سر ریڈ کلف کے سابق سکریٹری کرسٹوفر بومانٹ (CHRISTOPHER BEAMOUNT) نے اپنے ایک بیان میں جو غالباً اپریل ۱۹۹۲ء کے لندن ٹیلی گراف میں شائع ہو چکا ہے بتائی ہے کہ کس طرح ماؤنٹ بیٹن کے دباؤ میں آکر سر ریڈ کلف نے پنجاب کے بعض علاقے جنہیں وہ بنیادی طور پر پاکستان کو دینے کے حق میں فیصلہ کر چکے تھے ہندوستان کے حوالے کر دیئے

پر راضی ہو گئے۔ سیاسی بددیانتی کے اس افسوسناک واقعہ کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو اور کرشنا مینن سخت دباؤ ڈال رہے تھے کہ ماؤنٹ بیٹن کسی نہ کسی طرح سر ریڈکلف کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیں۔ اس سیاسی بددیانتی کو بروئے کار لانے میں مہاراجہ بیکانیز بھی اپنی ریاست کے مفاد کیلئے اپنا بھرپور کردار ادا کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماؤنٹ بیٹن نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ریڈکلف ایوارڈ میں مطلوبہ تبدیلی کیلئے ہر ممکن کوشش کرینگے۔ ماؤنٹ بیٹن کے بعض سینئر رفقائے کار نے انہیں اس عمل سے باز رکھنا چاہا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

رپورٹ میں مطلوبہ تبدیلی کے حصول کیلئے یہ ضروری تھا کہ ریڈکلف سے فوراً رابطہ کیا جائے چنانچہ ماؤنٹ بیٹن نے خفیہ طور پر ایک رات کرشنا مینن کو ریڈکلف کے پاس بھیجا کہ وہ ان کی طرف سے ریڈکلف کو ظہرانہ پر مدعو کریں۔ مقصد یہ تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریڈکلف کو ایوارڈ میں مطلوبہ تبدیلی کے لئے مجبور کیا جائے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈکلف کو ظہرانہ پر مدعو کیا لیکن راز داری کے پیش نظر یہ ہدایت بھی کی کہ وہ اپنے سکریٹری کرسٹوفر بومانٹ کو ہمراہ نہ لائیں۔ اسی ظہرانہ پر ریڈکلف کو مجبور کیا گیا کہ وہ ماؤنٹ بیٹن کی خواہش کے مطابق ایوارڈ میں تبدیلی کر دیں۔

سر ریڈکلف تقسیم ہند کے فوراً بعد متنازعہ سرحدوں کے سلسلے میں فیصلہ دینے کیلئے باؤنڈری کمیشن کے چیئرمین کی حیثیت سے مختصر عرصہ کیلئے ہندوستان آئے تھے اور انہیں ایک مقررہ مدت کے اندر اپنا کام جلد از جلد ختم کر دینا تھا۔ دامن وقت میں گنجائش نہ ہونے کے علاوہ ہندوستان کے گرم موسم نے انہیں

الگ پریشان کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ انگلستان واپس جانے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔ان حالات میں ریڈکلف وائسرائے ہند کے دباؤ میں آ گئے اور آخر کار اپنے ایوارڈ میں ہندوستان کے حق میں تبدیلی کر دی۔اس طرح ریڈکلف ایک ایسی بددیانتی کے مرتکب ہوئے جس کی ان سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

کرسٹوفر بومانٹ کے انکشافات ان حضرات کیلئے یقیناً حیرت کا باعث ہوں گے جو ماؤنٹ بیٹن کو امانت' دیانت' عدالت اور فرض شناسی کا پیکر سمجھتے چلے آرہے تھے لیکن وہ لوگ جو تقسیم ہند کے حوالہ سے ماؤنٹ بیٹن کے کردار کو جانتے ہیں ان کیلئے بومانٹ کے انکشافات قطعاً حیرت انگیز نہیں ہیں۔ تقسیم ہند کے پس منظر سے واقف ہر شخص یہ جانتا ہے کہ وائسرائے ہند کی حیثیت سے ماؤنٹ بیٹن کی تقرری پنڈت جواہر لال نہرو کی مرضی و منشاء کے مطابق عمل میں آئی تھی۔ اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم ہندوستان میں فیلڈ مارشل ویول کی جگہ کسی ایسے شخص کو وائسرائے مقرر کرنا چاہتے تھے جو کانگریس کیلئے قابل قبول ہو۔کرشنا منن جو اس زمانہ میں سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر لندن میں ہی قیام پذیر تھے انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کانگریس کے ہمدرد سر اسٹفورڈ کرپس (SIR STAFFORD CRIPS) کو یہ تجویز پیش کر دی کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کر دیا جائے۔کرپس نے جب یہ تجویز برطانیہ کے وزیر اعظم کلیمنٹ اٹیلی (CLEMENT ATTLEE) کو پیش کی تو وہ فوراً راضی ہو گئے۔

۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے نئے وائسرائے

کی حیثیت سے دہلی پہنچ گئے۔ دربار ہال میں رسم حلف برداری کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو بھی موجود تھے اور کیوں نہ موجود ہوتے دونوں آپس میں قریبی دوست تھے۔ جس زمانہ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن سنگاپور میں ساؤتھ ایشیا ہیڈ کوارٹر کے سربراہ تھے پنڈت نہرو جب وہاں گئے تو ماؤنٹ بیٹن نے ان کا بڑی گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا اور جب ماؤنٹ بیٹن کے بعض مشیروں نے انہیں مشورہ دیا کہ حکومت برطانیہ کے ایک باغی کی اس قدر عزت افزائی نہ کریں تو انہوں نے جواب دیا کہ ''میں ان کی عزت افزائی کیا کروں گا وہ خود میری عزت افزائی کر رہے ہیں۔ ایک دن آئے گا جب یہ ہندوستان کے وزیر اعظم ہوں گے''۔

ماؤنٹ بیٹن اپنے تعلقات پنڈت جواہر لال نہرو سے مزید مستحکم اور استوار کرنا چاہتے تھے۔ پنڈت نہرو کی بھی دلی آرزو تھی کہ وہ ماؤنٹ بیٹن اور ان کے خاندان سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جائیں تا کہ سیاسی فائدے حاصل کر سکیں۔ چنانچہ دونوں طرف سے آپس میں نجی دعوتوں اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان دعوتوں اور ملاقاتوں میں جب بھی موقع ملتا کانگریسی لیڈران قائد اعظمؒ کی کردار کشی کی ضرور کوشش کرتے۔ اسی قسم کی ایک دعوت میں اندرا گاندھی اور کرشنا مٹن بھی موجود تھے۔ ان دونوں نے قائد اعظمؒ کے خلاف دل کھول کر زہر افشانی کی۔ کرشنا مٹن کی دیدہ دلیری اور دروغ گوئی کی انتہا یہ تھی کہ انہوں نے ماؤنٹ بیٹن کے پریس اتاشی کیمپبل جانسن (CAMPBELL JOHNSON) کو جو خود بھی اس دعوت میں شریک تھے یہ باور

کرانے کی کوشش کی کہ قائداعظمؒ پیدائشی ہندو تھے اور یہ بات بھی کم حیرت انگیز نہیں کہ کیمپبل جانسن نے اس بہتان تراشی اور افترا پردازی پر نہ تو کسی تعجب کا اظہار کیا اور نہ اصل حقیقت جاننے کی کوشش کی۔

ماؤنٹ بیٹن اور کانگریسی لیڈران نہ صرف ذاتی طور پر ایک دوسرے کے انتہائی قریب تھے بلکہ آپس میں سیاسی ہم آہنگی بھی موجود تھی۔ چنانچہ ماؤنٹ بیٹن بھی تقسیم ہند کے سخت مخالف تھے اور ان کی خواہش تھی کہ متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر مسلم لیگ سے سمجھوتہ ہو جائے لیکن جب قائداعظمؒ کی سیاسی بصیرت اور اعلیٰ قیادت نے اس مقصد میں انہیں کامیاب نہ ہونے دیا تو بادل نخواستہ تقسیم ہند کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ مئی ۱۹۴۷ء کی دوسری تاریخ تھی جب اس منصوبہ کو لے کر لارڈ اسمے (LORD ISMAY) لندن روانہ ہوئے۔ ماؤنٹ بیٹن کو یقین تھا کہ اس منصوبہ کو ہندوستان کے تمام رہنما منظور کر لیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اعلان کر دیا کہ اس منصوبہ کو حکومت برطانیہ کی منظوری کے بعد لارڈ اسمے کی لندن سے واپسی پر ہندوستانی لیڈران کو پیش کر دیں گے۔ اس منصوبہ میں حسین شہید سہروردی کی یہ تجویز بھی شامل کی گئی تھی کہ اگر کسی صوبہ کی دونوں جماعتوں کی اکثریت یہ چاہتی ہے کہ وہ صوبہ آزاد و خود مختار رہے تو اس کی اجازت ہوگی۔ اس تجویز کے متعلق لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستانی رہنماؤں سے کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ انہیں اس کے بارے میں کچھ بتایا تھا لیکن ان کی کانگریس نوازی کا یہ عالم تھا کہ اس منصوبہ کی ایک نقل قبل از وقت پنڈت نہرو کو جو اس وقت کرشنامنن کے ساتھ ماؤنٹ بیٹن کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے

شملہ میں مقیم تھے خاموشی کے ساتھ پڑھنے کیلئے دے دی۔ پنڈت نہرو اس منصوبہ کو دیکھتے ہی چراغ پا ہو گئے اور اسے یکسر مسترد کردیا۔ یہ صورت حال لارڈ ماؤنٹ بیٹن کیلئے سخت تشویش کا باعث بن گئی۔ انہوں نے فوراً کرشنا منن کی خدمات حاصل کیں تاکہ ایک نیا منصوبہ تیار کیا جا سکے۔ راتوں رات ایک نیا منصوبہ تیار کرلیا گیا اور جب پنڈت نہرو نے یقین دہانی کردی کہ یہ منصوبہ کانگریس کیلئے قابل قبول ہوگا تب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر برطانوی حکومت سے فوراً گذارش کی کہ لارڈ اسمے جو منصوبہ لے کر گئے ہیں اس پر کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔ بعد میں ماؤنٹ بیٹن نیا منصوبہ لے کر لندن روانہ ہوئے۔ اس منصوبہ کے خالق کرشنا منن ان کے ہمراہ تھے۔

برطانوی حکومت نے نئے منصوبہ کو منظور کرلیا۔ ۲ جون ۱۹۴۷ء کو تمام ہندوستانی رہنماؤں سے اس منصوبہ کی منظوری بھی حاصل کرلی گئی اور ۳ جون ۱۹۴۷ء کی شام کو آل انڈیا ریڈیو سے ماؤنٹ بیٹن، قائداعظمؒ پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ نے اس منصوبہ کی بنیاد پر سمجھوتہ کا اعلان کیا۔ اصولی طور پر پاکستان عالم وجود میں آچکا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ کانگریسی لیڈران اور ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کو نقصان پہونچانے کے لئے اپنی کوششیں بھی شروع کردیں۔

سب سے پہلے ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز کردی کہ ہندوستان کی تمام ریاستیں جن کی مجموعی تعداد پانچ سو پینسٹھ تھی ہندوستان سے الحاق کرلیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے جب اس کا ذکر سردار ولبھ بھائی

پٹیل سے کیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑے اور کہنے لگے "مگر تمام ریاستوں کا الحاق ہونا چاہیے۔ اگر آپ ٹوکری میں درخت کے تمام کے تمام سیب لائیں گے تو میں خریدوں گا ورنہ نہیں" اپنی انتھک کوشش سے ماؤنٹ بیٹن نے آٹھ ریاستوں کے علاوہ باقی تمام ریاستیں سردار پٹیل کی ٹوکری میں لا ڈالیں باقی ماندہ ریاستوں میں پانچ ریاستیں پاکستان میں اور تین ریاستیں (جوناگڑھ، حیدرآباد اور جموں وکشمیر) ہندوستان میں تھیں۔ ان تین ریاستوں میں جموں وکشمیر ریاست کا ہندوستان سے الحاق ایک مشکل مرحلہ تھا کیونکہ ریاست کی بھاری اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کی دلی خواہش تھی کہ ریاست جموں وکشمیر کا الحاق کسی نہ کسی طرح ہندوستان کے ساتھ ہو جائے۔ چنانچہ ماؤنٹ بیٹن بہ نفس نفیس سرینگر پہنچ گئے کہ مہاراجہ سے ریاست کے الحاق پر بات چیت کریں اور جب مہاراجہ نے انہیں بتایا کہ وہ کسی قیمت پر اپنی ریاست کا الحاق پاکستان سے نہیں کریں گے تو ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ کو فوراً مشورہ دیا کہ وہ ریاست کا الحاق ہندوستان سے کر دیں لیکن اس وقت ماؤنٹ بیٹن کی کوششیں بارآور نہ ہو سکیں۔

ادھر پاکستان میں مسئلہ کشمیر پر بے چینی بڑھتی جا رہی تھی چنانچہ یکم اکتوبر ۱۹۴۷ء کے آخری دنوں میں جب پاکستان سے مجاہدین ریاست جموں وکشمیر میں داخل ہو گئے اور آثار کچھ یوں نظر آنے لگے کہ ریاست پر مجاہدین کا قبضہ ہو جائے گا تو ماؤنٹ بیٹن نے جو تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے گورنر جنرل بن چکے تھے اپنے دست راست کرشنامنن کو فوراً سرینگر روانہ کیا کہ وہ مہاراجہ کو مجبور کریں کہ ریاست کا الحاق ہندوستان سے کر دیں۔ مجاہدین کی یلغار

سے گھبرا کر اور کرشنا مَن کے دباؤ میں آ کر مہاراجہ نے آخر کار اپنی ریاست کا الحاق ہندوستان سے کر دیا۔ ریاست جونا گڑھ نے پاکستان سے بغیر کسی دباؤ کے الحاق کیا تھا لیکن اسکو ہندوستان نے تسلیم نہیں کیا تھا اور ریاست پر بزور شمشیر قبضہ کر لیا۔ جواز یہ پیش کیا گیا کہ ریاست میں عوام کی اکثریت غیر مسلم ہے اس لئے پاکستان سے اس کا الحاق قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اسی جواز کا سہارا لے کر حکومت ہندوستان نے ریاست حیدر آباد پر بھی قبضہ جما لیا تھا لیکن کشمیر کے معاملہ میں الحاق کو ہی قبضہ کی بنیاد قرار دے دیا گیا۔

تقسیم ہند کے حوالے سے ماؤنٹ بیٹن کا کردار یقیناً داغدار تھا۔ انہوں نے بظاہر غیر جانبداری کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

سرسید احمد خاں کی خدمات

سلطنت مغلیہ کے بعض علاقوں میں باغیانہ سرگرمیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد پھیلتا چلا گیا۔ مملکت بدامنی اور انتشار کا شکار ہوگئی۔ مرکز کمزور ہوگیا اور حکومت کے زوال پذیر ہونے کے آثار صاف نظر آنے لگے۔ انگریز جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی میں تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے ملک پر حکمرانی کے خواب دیکھنے لگے۔ اپنی اس آرزو کی تکمیل کیلئے انہوں نے ان لوگوں کو جو مغلیہ سلطنت کے خلاف مصروف عمل تھے ہر ممکن امداد فراہم کرنا شروع کردی۔ ملک وقوم کے غداروں کو اپنا ہمنوا بنا کر انگریز اپنی اہمیت اور عسکری طاقت میں برابر اضافہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انہیں ''بادشاہ گر'' کہا جانے لگا۔ طالع آزماؤں کو یقین ہوگیا تھا کہ فرنگی جس کا ساتھ دیں گے فتح ونصرت اسی کا مقدر ہوگی۔

سلطنت کے بہی خواہوں کو انگریزوں کے ناپاک عزائم کا پورا پورا علم تھا۔ محبان وطن کو یہ احساس تھا کہ اگر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات اوران

کی قوت کو ختم نہ کیا گیا تو وہ ایک نہ ایک دن ہندوستان کے حاکم بن بیٹھیں گے۔اس خطرہ کے پیش نظر ۱۸۵۷ء میں آخری بار کوشش کی گئی کہ انگریزوں کو شکست دے کر ان کی طاقت کو ختم کر دیا جائے اور انہیں ملک سے نکال باہر کیا جائے۔سلطنت مغلیہ کے حامیوں اور انگریزوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا اور وہ یہ جنگ آزادی ہار گئے۔انگریز ہندوستان کے حکمران بن بیٹھے، سلطنت مغلیہ کا چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔حاکم، محکوم بن گئے۔ مسلمان عرش سے فرش پر گر گئے، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں اور کدھر جائیں، ان کا وقار مٹی میں مل گیا، ان کی عظمت ماضی کی داستان بن گئی، ایک عجیب بے بسی، بے کسی اور پراگندگی کا عالم تھا ہر طرف شکست خوردگی، مایوسی اور سراسیمگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

مغلیہ سلطنت کی تباہی و بربادی کے مضر اثرات فطری طور پر زیادہ تر مسلمانوں پر پڑے، غیر مسلم نہ صرف انگریزوں کے ظلم وستم سے عموماً محفوظ رہے بلکہ ان کی حالت بھی بہتر ہوتی چلی گئی، ماحول کو اپنے موافق پا کر غیر مسلموں نے ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع کر دیں، ملک کے نظم ونسق پر اپنی گرفت مضبوط سے مضبوط تر رکھنے اور انگریزوں کے زیر سایہ زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے انگریزی تعلیم کے حصول پر سب سے زیادہ توجہ دی، اس کے برخلاف مسلمان اپنی تباہی و بربادی پر دم بخود ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔

توقعات اورخواہشات کے برعکس جب کوئی سنگین واقعہ ظہور پذیر ہو جاتا ہے تو لوگوں کے دل ودماغ ماؤف ہو جاتے ہیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہوکر رہ جاتی ہے جنگ آزادی میں خلاف توقع اپنی عبرتناک شکست کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی یہی کیفیت ہوگئی، ان کیلئے ممکن نہ رہا کہ اپنی فلاح و بہبود کیلئے کوئی راہ تلاش کرسکیں۔ لاشعوری طور پر وہ انگریزوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہوئے ان سے شدید نفرت کرنے لگے، یہاں تک کہ انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کرنا ہندوستانی مسلمانوں کے نزدیک شرک بن گیا۔

اس منفی اور مضر انداز فکر کو تقویت پہنچانے میں اکثر نام نہاد مولویوں اور ملاؤں نے اپنا روایتی کردار ادا کیا اور حضرت رسول مقبول ﷺ کی اس مستند حدیث کے علی الرغم کہ ''اے مسلمانو! علم کو حاصل کرو اگر چہ وہ چین ہی میں کیوں نہ ملے۔'' انگریزی تعلیم حاصل کرنے کو بھی کفر والحاد قرار دے ڈالا۔

عجب نہیں کہ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو اس نہج پر بھڑکانے میں مسلمانان ہند کے دشمنوں کا بھی ہاتھ رہا ہو جو انہیں انگریزی تعلیم سے دور رکھ کر خود بام ترقی پر پہنچنے کیلئے بے چین و بے قرار تھے۔ مسلمانوں کے اس انداز فکر کے اسباب وعلل کچھ بھی رہے ہوں نتیجہ بہر حال یہی نکلا کہ وہ ترقی کی دوڑ میں ہندوستان کی دیگر اقوام کے

مقابلہ میں بہت پیچھے رہ گئے اوران کی زبوں حالی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

اس وقت مسلمانوں میں ایسے افراد یقیناً موجود تھے جو اس المناک صورتحال سے فکرمند تھے اورانہیں اس بات کا احساس تھا کہ اگر مسلمانوں کی مشکلات کا فوری حل نہ تلاش کیا گیا تو ان کی تقدیر شاید کبھی نہ بدل سکے۔ ان افراد میں سرسید احمد خاں کو ایک منفرد مقام حاصل تھا۔ حالات اور واقعات کا غائر مشاہدہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ جب تک حکومت برطانیہ اور مسلمانوں میں باہمی اعتماد کی فضا قائم نہیں ہو جاتی اور ہندوستانی مسلمان انگریزی تعلیم کے خلاف اپنا رویہ نہیں بدل لیتے ان کا مستقبل روشن نہیں ہو سکتا۔ اپنے ان خیالات کی روشنی میں انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی بقا اور بہبود کیلئے جدوجہد شروع کردی، تقریروں اورتحریروں کے ذریعہ سرسید احمد خاں نے جنگ آزادی کے حقیقی اسباب پرروشنی ڈالی تاکہ انگریزوں کو صحیح صورت حال کا علم ہوجائے، ساتھ ہی ساتھ آپ نے مسلمانوں کو ترغیب دلائی کہ وہ انگریزی تعلیم بھی حاصل کریں اور ہندوستان کی دیگر اقوام کے شانہ بہ شانہ چل کر ترقی کی منزلیں طے کریں۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کی کوششیں شروع کیں تو ان کی شدید مخالفت کی گئی۔ نام نہاد مولویوں اور تنگ نظر ملاؤں نے ان کے خلاف فتوے جاری کئے اوراس پر بھی تشفی نہ ہوئی تو مکہ اور بغداد سے کفر کے فتوے درآمد کرکے ملک بھر میں تقسیم کئے، اکثر

مسلم جریدوں اوراخباروں میں ان کی شدید مخالفت کی گئی۔ان کی ہجو کیلئے شاعری کو بھی ذریعہ بنایا گیا لیکن سرسید احمد خاں نے ان نام نہاد مولویوں اور کوتاہ بین ملاؤں کی ہرزہ سرائی کی قطعاً پرواہ نہ کی اوراپنے مشن کو پورے عزم واستقلال کے ساتھ جاری رکھا۔ بالآخر ان کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور وہ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔اس ضمن میں نواب محسن الملک، نواب وقارالملک، سید امیر علی اور دیگر ممتاز مسلم شخصیات کی خدمات بھی قابل صد تحسین ہیں۔

تعلیم کے علاوہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی مسلمانوں کی ترقی سرسید احمد خاں کا مطمع نظر تھا چنانچہ مسلم کالج کے علاوہ آپ نے ۱۸۸۶ء میں مسلم ایجوکیشنل کانگریس قائم کی جس کا مرکز بھی علی گڑھ تھا اس کا نام ۱۸۹۰ء میں بدل کر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس رکھ دیا گیا۔ مسلم کالج اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا وجود سرسید احمد خاں کی مسلسل جدوجہد کا ثمر تھا۔ان کی دلی آرزو تھی کہ مسلم کالج ایک یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرلے لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور ۱۸۹۸ء میں انتقال فرماگئے، بعد میں مہاراجہ محمود آباد اور بعض دیگر نامور شخصیتوں کی کوششوں کے نتیجہ میں مسلم کالج نے مسلم یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرلیا۔

۱۸۷۵ء سے ۱۹۴۷ء تک پچھتر سال سے بھی کم عرصہ میں اس شہرۂ آفاق یونیورسٹی سے ہزاروں مسلمان طلباء فارغ التحصیل ہو

کر ہندوستان کے ہر صوبہ میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتے رہے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر ہندو پاک میں جتنے بھی نامی گرامی مسلمان گزرے ہیں ان میں زیادہ تر مسلم یونیورسٹی کے طالبعلم رہ چکے تھے، سیاسی میدان میں بھی علی گڑھ یونیورسٹی نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔کوئی سیاسی تحریک مسلمانوں کی ایسی نہ تھی جس کی حمایت اس یونیورسٹی کے طالب علموں نے نہ کی ہو، تحریک پاکستان میں علی گڑھ کے طالب علموں نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہیں۔ پاکستان کو حقیقت کا روپ دینے میں علی گڑھ کے طالب علموں کا بڑا حصہ ہے، پاکستان کے قیام سے قبل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے قائداعظمؒ کے پیغام کو گھر گھر پہنچایا، صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں مسلم لیگ کی شاندار کامیابی بھی بڑی حد تک علی گڑھ کے طالب علموں کی رہین منت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریک پاکستان میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طالب علموں نے تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے۔

مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی، ۱۹۴۰ء میں لاہور میں منعقد ہونے والے اس کے اجلاس میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا اور سات سال بعد چودہ اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔تحریک پاکستان کے حوالہ سے اگر ہم مسلمانوں کے احیاء کیلئے سر سید احمد خاں کی جدوجہد کا جائزہ لیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم کالج، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس،

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مسلم لیگ اور پاکستان ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں اس لئے یہ کہنا کہ سر سید احمد خاں نے مسلم کالج قائم کر کے دراصل پاکستان کی خشت اول رکھی تھی غلط نہ ہوگا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی بیداری اور ان کے روشن مستقبل کیلئے آپ نے جو تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

حصہ دوم

قراردادِ پاکستان

منزل کا تعین

جنگ آزادی سے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء تک

مغلیہ خاندان کے مشہور بادشاہ شہنشاہ محی الدین عالمگیر (اورنگ زیب) کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کے زوال کا عمل تیز ہوگیا۔حکومت کے مخالفین سر اٹھانے لگے۔ملک وملت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔حکومت کے زیرنگین علاقے آزاد وخودمختار ہوگئے۔مرکز کمزور سے کمزور تر ہوتا گیا۔انگریزوں کی جماعت جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ۱۶۰۰ء میں تجارت کی غرض سے ہندوستان آئی تھی وہ بھی ملک کے بگڑتے ہوئے حالات سے فائدہ اٹھانے میں ہمہ تن مصروف ہوگئی اوراس نے حکمت عملی سے انتہائی دوررس تجارتی اورسیاسی فائدے حاصل کئے۔ملک کے انتظامی امور میں اپنے اثرورسوخ اوراپنی طاقت میں اس قدراضافہ کرلیا کہ ہرطالع آزما کی یہی خواہش اورکوشش رہتی تھی کہ اسے انگریزوں کی حمایت حاصل ہوجائے تاکہ اپنے حریف پرغلبہ حاصل کرسکے۔ہندوستان میں انگریزوں کی قوت میں روزافزوں اضافہ سے خودحکمران خائف رہنے لگے۔۱۸۵۷ء تک حالات اس نہج پرپہنچ گئے کہ بادی النظر میں حکومت مغلوں کی تھی لیکن پس پردہ سکہ انگریزوں کارواں تھا۔اپنی ریشہ دوانیوں اور

سازشوں کے ذریعہ ان لوگوں نے سلطنت مغلیہ کو بڑی حد تک مفلوج کر دیا تھا۔ ملکی معاملات پر ان کی گرفت اس قدر مضبوط ہوگئی تھی کہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود حکومت انہیں لگام نہ دے سکی۔

سربراہان حکومت کا ذکر کیا عوام الناس بھی انگریزوں کے طرز عمل سے تنگ آچکے تھے۔ اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا بالآخر انگریزوں کے خلاف نفرتوں کا آتش فشاں اچانک پھٹ پڑا۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ۱۸۵۷ء میں بعد از خرابی بسیار آخری بار کوشش کی گئی کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر ان سے نجات حاصل کی جائے۔ چنانچہ اپنی آزادی، خودمختاری اور حاکمیت کے لئے حکومت کے حامیوں نے انگریزوں سے باقاعدہ جنگ چھیڑ دی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ ہزاروں محبان وطن نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا لیکن عدم اتحاد اور ناقص منصوبہ بندی کا یہ نتیجہ نکلا کہ حکومت کو عبرتناک شکست ہوئی۔ سلطنت مغلیہ کا چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا۔ غداران وطن کی ناپاک سازشیں رنگ لائیں۔ انگریز ملک کے سیاہ وسفید کے مالک بن بیٹھے۔ مغلیہ سلطنت کے نیک خصلت تاجدار بہادر شاہ کو تخت وتاج سے محروم کر کے محصور کر دیا گیا۔

محبان وطن نے سلطنت مغلیہ کو تباہی و بربادی سے بچانے کے لئے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیا تھا۔ بدقسمتی سے پانسا الٹا پڑا اور وہ بازی بری طرح ہار گئے۔ اہل وطن پر قیامت ٹوٹ پڑی بالخصوص مسلمان بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ عرش پر جھولنے والے فرش پر آگرے۔ ایک عجیب بے بسی و بے کسی کا عالم تھا۔

اکابرین سلطنت مجبور ولاچار ہو کر رہ گئے۔ حکومت کے حامیوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ انگریز اپنے مخالفین سے چن چن کر بدلہ لے رہے تھے۔ مغل شہزادوں کے سر قلم کیے گئے۔ ہزاروں مسلمانوں کو تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ غرض ہر طرف ظلم و ستم کا بازار گرم تھا۔

جنگ آزادی کے بعد مسلمانان ہند شکست خوردگی اور مایوسی کا شکار ہو گئے۔ ان کی عظمت وشوکت ماضی کی داستان بن چکی تھی ان کا جاہ وحشم ملیامیٹ ہو چکا تھا۔ متمول اور اہل ثروت افراد کی ایک کثیر تعداد دیکھتے ہی دیکھتے کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئی۔ تن ڈھانپنے اور پیٹ بھرنے کے لالے پڑ گئے۔ بعض گھروں میں جہاں گھی کے چراغ جلا کرتے تھے وہاں دیا جلانے کو تیل بھی میسر نہ تھا۔ ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں میں مشکل سے کوئی مفلس دکھائی دیتا تھا۔ سلطنت کے خاتمہ کے بعد رفتہ رفتہ یہ نوبت آ گئی کہ زندہ رہنے کیلئے بعض افراد اپنے پالتو جانور اور گھر کا سامان فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ غرض یہ کہ مسلمانوں کا مستقبل انتہائی تاریک نظر آرہا تھا۔

ان نامساعد اور مایوس کن حالات میں مسلمانوں کی ازسرنو تنظیم کیلئے ایک ایسے رہنما کی ضرورت تھی جو انہیں شاہراہ ترقی پر گامزن اور ان کی خوداعتمادی کو بحال کر سکے۔ خوش قسمتی سے انہیں سرسید احمد خان جیسا رہبر مل گیا جس نے ان کی فلاح و بہبود اور ترقی کیلئے تن من دھن کی بازی لگا دی۔ مسلمانان ہند کے اس مسیحا اور مرد آہن نے اپنی دوراندیشی اور بصیرت سے ان کی تقدیر بدل

ڈالی۔ سرسید احمد خان نے اپنے مقاصد کے حصول کیلئے دو نکاتی حکمت عملی اختیار کی۔ پہلے مرحلہ میں انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں کے موقف کی بھرپور ترجمانی کی جس کی وجہ سے انگریزوں کی معاندانہ روش میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہوئی اور مسلمانوں پر کیے جانے والے مظالم میں خاطر خواہ کمی ہوتی گئی۔ وہ طوفان بلاخیز جو مسلمانوں کے لئے وبال جان بن چکا تھا بالآخر اس کی بلاخیزی میں کمی آنا شروع ہوگئی۔

حالات کو اس طرح سازگار بنانے کے بعد سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ انگریزی تعلیم بھی حاصل کریں تاکہ ہندوستان کی دیگر اقوام کی طرح ملک کے نظم ونسق میں حصہ لینے کے قابل بن سکیں۔ سرسید احمد خان کی حکمت عملی کا یہ دوسرا پہلو تھا۔ انہوں نے جب اپنی اس مہم کا آغاز کیا تو عاقبت نااندیش اور تنگ نظر مولویوں نے ایک طوفان اٹھالیا۔ کوتاہ بینوں نے سرسید احمد خان کی راہ میں سخت مشکلات پیدا کیں۔ انہیں تکفیر کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کے خلاف بغداد اور سعودی عرب سے کفر کے فتوے حاصل کر کے ملک بھر میں تقسیم کئے گئے۔ پھر بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری اپنے مشن کی تکمیل کیلئے مختلف سیاسی، سماجی، تعلیمی انجمنیں اور ادارے قائم کئے۔ ان میں مسلم کالج اپنی نوعیت کے اعتبارر سے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ سرسید احمد خان کی وفات کے تقریباً چالیس سال بعد یہی کالج سر آغا خان، مولانا شوکت علی، مہاراجہ محمود آباد اور دیگر مسلم رہنماؤں کی کوششوں سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بن گیا۔

سر سید احمد خان مسلمانان ہند کو شاہراہ ترقی پر گامزن کر چکے تھے لیکن منزل بہت دور تھی۔ ان کے سفر آخرت کے بعد دوسرے ممتاز رہنماؤں نے مسلمانوں کے سیاسی بیداری کے عمل کو جاری رکھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوگئی لیکن مسلمانان ہند میں عدم اتفاق و یکجہتی کی وجہ سے سیاسی میدان میں اسے بہت عرصہ تک وہ اہمیت حاصل نہ ہوسکی جو کانگریس کو حاصل تھی۔ ۱۹۳۷ء کے صوبائی الیکشن میں آل انڈیا کانگریس بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی، اس وقت اس کے سربراہ پنڈت جواہرلال نہرو تھے۔ اپنی شاندار کامیابی پر وہ اس قدر نازاں ہوئے کہ مسلم لیگ کے وجود ہی کو نظر انداز کر بیٹھے۔ ایک بیان میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں ایک آل انڈیا کانگریس اور دوسری حکومت برطانیہ۔

پنڈت نہرو کا یہ اعلان مسلم قیادت کے لئے ایک کھلا چیلنج تھا قائداعظمؒ نے اسے قبول کرلیا۔ پنڈت نہرو کے دعویٰ کو مسترد کرتے ہوئے انتہائی عزم و حوصلہ کے ساتھ اعلان کیا کہ ہندوستان میں ایک تیسری پارٹی بھی ہے اور اس کا نام ملت اسلامیہ ہے۔ قائداعظمؒ کی آواز تمام مسلمانان ہند کی آواز بن گئی۔ ان میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوگیا۔ مسلم لیگ کی ہر دلعزیزی میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں اس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا جو ہر اعتبار سے بے حد کامیاب رہا، لکھنؤ کے اجلاس

کے بعد دسمبر ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کا چھبیسواں سالانہ اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا۔ ہندوستان کے طول و عرض سے ہزاروں مسلمان اس اجلاس میں شریک ہوئے فرزندان توحید کا جوش و خروش قابل دید تھا۔ اس روح افزا منظر سے قائداعظمؒ بھی بہت متاثر ہوئے، اپنے خطبہ صدارت میں انہوں نے مسلم لیگ کی قوت میں بے پناہ اضافہ پر مسرت و اطمینان کا اظہار کیا۔ آل انڈیا کانگریس پر سخت تنقید کی اور اس کے اس دعویٰ کی دھجیاں بکھیر دیں کہ وہ ملک کی واحد سیاسی جماعت ہے۔

- اپریل ۱۹۳۹ء میں مسلم لیگ کا ایک خاص اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس بھی مسلمانان ہند کے اتحاد، یقین محکم اور تنظیم کا آئینہ دار تھا۔ اس موقع پر قائداعظمؒ نے دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا کہ ہندوستان کے سیاسی حل کیلئے مسلم لیگ کوئی ایسا آئین قبول نہیں کرے گی جس میں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ موجود نہ ہو، کانگریس کا دعویٰ تھا کہ وہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کی بھی نمائندہ جماعت ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی اس کے قول و فعل میں کوئی مطابقت نہ تھی، اس کے ظاہر و باطن میں واضح تضاد تھا۔ اس کے معاندانہ رویہ اور اس کی دورُخی پالیسی سے قائداعظمؒ خوب واقف تھے، انہیں کامل یقین تھا کہ کانگریس کی جدوجہد کا واحد مقصد یہ تھا کہ ملک میں اکثریت کا راج قائم کیا جائے۔ اس کا اندازہ عام مسلمانوں کو بھی ہو چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے من حیث القوم کانگریس کو یکسر مسترد کر دیا اور

قائد اعظمؒ کی رہنمائی میں اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔

۱۹۳۷ء میں پنڈت نہرو جس پارٹی کے وجود کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھے وہ اگلے تین سال سے بھی کم عرصہ میں مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت بن گئی، اس کے باوجود کانگریس کے رویہ میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہ آئی، وہ مسلمانوں کے حقوق و مطالبات کو برابر نظر انداز کرتی رہی، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم زعماء دو قومی نظریہ کی بنیاد پر تقسیم ہند کی بات کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی شہر میں مسلم لیگ کے کھلے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں واضح طور پر مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں ان کی علیحدہ، آزاد خود مختار مملکت قائم کی جائے، یہی قرارداد، پاکستان کے قیام کی بنیاد بن گئی۔ اس طرح مسلمانوں کا وہ کارواں جو ۱۸۵۷ء کے بعد سر سید احمد خان کی سربراہی میں شاہراہ ترقی پر گامزن ہوا تھا بعد میں قائد اعظمؒ کی قیادت میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اپنی منزل مقصود متعین کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

قرارداد پاکستان کا پس منظر

شہنشاہ اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں سلطنت مغلیہ نے جو عروج حاصل کیا تھا وہ قائم نہ رہ سکا، زوال کے آثار اورنگ زیب کی زندگی ہی میں نظر آنے لگے تھے، ملک کے بعض علاقوں میں بدامنی پھیلنا شروع ہو چکی تھی۔ خصوصاً مرہٹوں نے شیوا جی کی قیادت میں حکومت کے لئے سنگین مشکلات پیدا کر دی تھیں، ان تمام دشواریوں کے باوجود سلطنت کی سالمیت اور خود مختاری بہر حال برقرار رہی لیکن ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد زوال کا عمل تیز ہو گیا۔ اورنگ زیب کے جانشینوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ ہوا جو سلطنت کی زوال پذیری کو روک سکتا۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملہ نے سلطنت کو اور بھی کمزور بنا دیا اور جب انگلستان کی ملکہ الزبتھ اول کے دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر سایہ تجارت کی غرض سے انگریز مشرقی ہندوستان پہنچے تو انہوں نے بھی سلطنت کی زبوں حالی سے پورا فائدہ اٹھایا اور نت نئی سازشوں کے ذریعہ اپنا اثر و رسوخ پورے ملک میں بڑھانے اور حکومت کی بنیادوں کو کمزور سے کمزور تر کرنے میں منہمک ہو گئے۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت

کے خلاف ایک خونریز جنگ کے نتیجہ میں انگریز ملک کے حاکم ومختار بن بیٹھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہزیمت اٹھانے کے بعد ہندوستان کے مسلمان شکست خوردگی اور مایوسی کا شکار ہوگئے۔ ان کا وقار مٹ گیا اور ان کی عظمت اور عزت خاک میں مل گئی۔ ایک عجیب بے بسی اور بے کسی کا عالم تھا، آسودہ حال اشراف مفلوک الحالی کا شکار ہوگئے، محلوں میں زندگی بسر کرنے والے بعض افراد تن ڈھکنے اور پیٹ بھرنے کے لئے اپنے گھر میں استعمال ہونے والے برتنوں اور پالتو پرندوں تک کو فروخت کرنے پر مجبور ہوگئے۔

انگریزوں نے فطری طور پر مسلمانوں کو اپنا حریف سمجھ لیا تھا اور مسلمانوں نے انگریزوں کو اپنا دشمن گردانتے ہوئے ہر اس چیز سے اجتناب کیا جس کا تعلق کسی نہ کسی عنوان سے انگریزوں سے تھا۔ چنانچہ انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کرنا مسلمانوں نے عام طور پر ایک غیر مستحسن فعل اور بعض ملاؤں نے شرک قرار دیا، ادھر غیر مسلموں نے مغلیہ سلطنت کی تباہی و بربادی کو اپنے لئے ایک نیک فال تصور کیا اور اپنی فلاح و بہبود کی طرف متوجہ ہوگئے۔ انہوں نے انگریزوں سے بھرپور تعاون کیا اور ہر وہ طریقہ اختیار کیا جو ان کی ترقی وخوشحالی کے لئے مددگار و معاون ثابت ہوسکتا تھا۔ انگریزی زبان کی مخالفت کرنے کے بجائے انہوں نے بڑی شدومد کے ساتھ اس زبان میں تعلیم حاصل کرنا شروع کردی، نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں کو ہر محکمہ میں ملازمتیں اور کلیدی عہدے حاصل ہوتے چلے گئے اور وہ ملک کے نظم ونسق میں اہم کردار ادا کرنے

لگے، اس کے برخلاف مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ دنیا ومافیہا سے بے خبر اپنی پسماندگی اور زبوں حالی پر کف افسوس ملتے اور انگریزوں سے رسم وراہ رکھنے والوں کے خلاف کفر کے فتوے جاری کرتے رہے، لیکن اپنی ترقی وخوشحالی کیلئے کوئی واضح راہ تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

یہ تھے وہ حالات وواقعات جن کا مشاہدہ سرسید احمد خاں بغور کررہے تھے، انہیں یقین تھا کہ تباہی اور بربادی کے اس سیلاب کو نہ روکا گیا تو وہ مسلمانوں کو ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ایک مفلس اور لاچار قوم بنا کر رکھ دے گا مسلمانوں کی عظمت اور وقار کی بحالی کیلئے ضروری تھا کہ اس طوفان کا زور توڑ دیا جائے جو اُن کے درخشاں ماضی کو تاریک مستقبل میں تبدیل کئے دے رہا تھا، اس مقصد کے حصول کیلئے سرسید احمد خاں نے ایک لائحہ عمل وضع کیا جس کی تکمیل کیلئے دو باتیں اہم تھیں، پہلی بات تو یہ کہ انگریزوں کو مسلمانوں سے جو دشمنی تھی اسے ختم کیا جائے تا کہ حکومت وقت مسلمانوں کے خلاف اپنا سخت گیر رویہ تبدیل کر دے۔ ''اسباب بغاوت ہند'' اور اپنی دیگر تحریروں کے ذریعہ سرسید احمد خاں نے انگریزوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کیا اور بڑی حد تک ان کی رائے ہموار کر لی۔

مسلمانوں کی ترقی اور ان کی سیاسی بیداری کیلئے دوسری ضروری بات یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کے دلوں میں نفرت کی جو آگ بھڑک رہی تھی اسے ٹھنڈا کیا جائے اور انہیں جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا

جائے تاکہ ملک کے نظم ونسق میں غیر مسلموں کے شانہ بہ شانہ اپنا کردار ادا کرسکیں اور اپنے حقوق کی حفاظت کرسکیں۔ اس ضمن میں سرسید احمد خاں نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تو تنگ نظر مسلمانوں نے سخت مخالفت کی اور انہیں تکفیر کا ہدف بنایا لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور مقصد کے حصول کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھی، مختلف ادارے قائم کیے جن میں مسلم کالج (جو تقریباً چالیس سال بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بن گیا)، آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس، انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (INDIAN PATRIOTIC ASSOCIATION) اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن (ANGLO ORIENTAL DEFENCE ASSOCIATION) خاص طور پر قابل ذکر ہیں سرسید احمد خاں کی گراں بہا خدمات اور ان کی انتھک جدوجہد کا ثمر تھا کہ مسلمانانِ ہند نہ صرف تعلیم کے میدان میں بلکہ سیاست کے میدان میں بھی منزلیں طے کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ ڈھاکہ میں قائم ہوگئی۔ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے اس عمل کا مشاہدہ کرنے کیلئے سرسید احمد خاں خود اس دنیا میں موجود نہ رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا نتیجہ تھا جو وہ اپنی حیاتِ ظاہری میں انجام دے چکے تھے۔ غلط نہ ہوگا کہ اگر یہ کہا جائے کہ سرسید احمد خاں کی قائم کردہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس معنوی اعتبار سے آل انڈیا مسلم لیگ کا ہراول دستہ تھی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام تو عمل میں آ چکا تھا لیکن مسلمانوں میں عدم اتحاد اور آل انڈیا کانگریس کے معاندانہ اور مخالفانہ پروپیگنڈے کی وجہ سے ۱۹۳۷ء کے الیکشن میں جب اسے عبرتناک شکست ہوئی تو کانگریس نے مسلم لیگ کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بہ بانگ دہل اعلان کیا ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں ایک کانگریس اور دوسری حکومت برطانیہ۔ پنڈت نہرو کا یہ دعویٰ برصغیر ہند کے مسلمانوں کے لئے ایک کھلا چیلنج تھا۔ قائد اعظمؒ نے اس چیلنج کو قبول کیا اور پورے عزم و یقین کے ساتھ جواب دیا: ''نہیں۔ ہندوستان میں ایک تیسری طاقت بھی ہے اور اس کا نام ملت اسلامیہ ہے''۔ قائد اعظمؒ کے ان الفاظ نے مسلمانوں کے فرس ہمت کو مہمیز لگائی، وہ خواب غفلت سے بیدار ہونے لگے، مسلم لیگ کی ہر دلعزیزی میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا اور مسلمانان ہند متحد ہو کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے لگے۔

قائد اعظمؒ کی فقید المثال صلاحیتوں، سیاسی بصیرت وتدبر کا نتیجہ تھا کہ ایک شکست خوردہ جماعت جس کے وجود سے پنڈت نہرو ۱۹۳۷ء میں انکار کر رہے تھے آئندہ چند برسوں میں ایک تیسری طاقت بن کر مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کیلئے آل انڈیا کانگریس اور حکومت برطانیہ سے نبرد آزما ہو گئی، کانگریس کی پالیسیوں سے یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ اس کا مقصد دراصل یہ ہے کہ ایک قوم کی بنیاد پر ملک میں اکثریت کا راج قائم

کردیا جائے، قائداعظمؒ کانگریس کے اس موقف کوتسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے کیونکہ وہ مسلمانوں کو ہراعتبار سے ہندوستان کی ایک الگ قوم سمجھتے تھے، یہی وہ ''دوقومی نظریہ'' تھا جس کو بنیاد بنا کر قائداعظمؒ نے برصغیر ہند کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ یہ مطالبہ کانگریسی لیڈران کے سینہ میں خنجر بن کر اترا۔ انہوں نے اس مطالبہ کی مخالفت میں ایک طوفان برپا کردیا۔ کسی نے دعویٰ کیا ہم بھارت کوٹکڑے ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے، کسی نے اعلان کیا پاکستان صرف میری لاش پر بن سکتا ہے، غرضیکہ تمام کانگریسی لیڈران نے مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگادیا لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ مسلم لیگ کی ہردلعزیزی اور قوت میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۰ء میں لاہور شہر میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ۲۳ مارچ کو وہ قرارداد منظور کی گئی جسے تاریخ نے ''قرارداد پاکستان'' کے نام سے محفوظ کرلیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء تحریک پاکستان کا اہم سنگ میل ہے۔ یہی وہ تاریخ ہے جس کے سات سال بعد برطانوی حکومت کے نمائندے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور آل انڈیا کانگریس کی سیاسی بددیانتیوں، ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے باوجود پاکستان قائم ہوکر رہا جس کا بیڑا قائداعظمؒ نے اٹھایا تھا، لاہور کے تاریخی شہر میں تعمیر کردہ ''مینار پاکستان'' آج اسی قرارداد پاکستان کے پس منظر کی یاد دلا رہا ہے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء منزل بہ منزل

تاریخی اور سیاسی پس منظر کو سامنے رکھا جائے اور واقعات کے تسلسل کا جائزہ لیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی جانب تحریک پاکستان کے سفر کا آغاز اسی وقت شروع ہو گیا تھا جب برطانیہ کے چند باشندوں نے ہندوستان میں تجارت کی غرض سے ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی تشکیل دی تھی۔ بظاہر اس کمپنی کا دائرہ عمل تجارت تھا لیکن اس نے حکومت برطانیہ کو ایسے سیاسی مواقع فراہم کیے اور ایسی حکمت عملی اختیار کی کہ کم وبیش ڈھائی سو سال بعد انگریز ہندوستان کے حکمران بن گئے، برطانوی حکومت نے اس کمپنی کی شروع ہی سے پشت پناہی کی اس کے قیام کے پندرہ سال بعد تک کسی دوسری برطانوی کمپنی کو مجاز نہ تھا کہ وہ ہندوستان میں کسی قسم کی تجارت کر سکے۔ ۱۶۱۴ء میں اس کے کارندوں نے سورت کے مقام پر اپنی پہلی نوآبادی قائم کی۔ کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا، ہندوستان کے مختلف شہروں میں اس نے

کارخانے قائم کیے اور سورت کے علاوہ مدراس اور کلکتہ میں بھی اپنے مراکز قائم کر لئے ، اپنے اثر ورسوخ کو مزید بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی غرض سے شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں SIR THOMAS ROE کو اپنا نمائندہ نامزد کر دیا جو حکومت برطانیہ اور خود کمپنی کے مفادات کی پوری پوری دیکھ بھال کرتا رہا۔

یوں تو شاہجہاں کے دور میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ترقی کی لیکن کلکتہ شہر میں فورٹ ولیم نامی قلعہ کی تعمیر کے لئے شہنشاہ اورنگ زیب سے اجازت نامہ حاصل کرنے اور قلعہ کی تعمیر مکمل کر لینے کے بعد انگریزوں نے اپنی تجارتی اور عسکری سرگرمیوں میں خوب اضافہ کیا۔

اورنگ زیب کا دور حکومت بہت کامیاب تھا۔ غلط نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ شہنشاہ اورنگ زیب کے دور میں مغلیہ سلطنت کا ستارہ اپنے عروج پر تھا لیکن افسوس کہ اورنگ زیب کے آخری زمانہ میں حالات نے ایک نئی کروٹ لی، مختلف علاقوں میں بے چینی، سرکشی اور بغاوت کے آثار نظر آنے لگے، مرہٹوں نے تو کھلے عام حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے تھے۔ ان تمام ناگہانی دشواریوں اور مشکلات کے باوجود اورنگ زیب کی زندگی تک حالات اور امور سلطنت بڑی حد تک قابو میں رہے لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کے زوال کا عمل تیز ہوگیا۔ سازشوں کا جال پھیلتا چلا گیا، حکومت کی جڑیں کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئیں، اورنگ زیب کے بعد کوئی فرمانروا ایسا

نہ ہوا جو سلطنت مغلیہ کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھال لیتا، انگریزوں نے اس صورتحال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور تجارتی سرگرمیوں کی آڑ میں اپنی فوجی اور سیاسی طاقت اس قدر مستحکم کر لی کہ وہ ہندوستان میں ایک ''سپر پاور'' بن گئے، طالع آزماؤں کو یقین ہو چکا تھا کہ انگریز جس کے حامی و مددگار ہوں گے فتح و کامرانی اس کے قدم چومے گی۔

مغلیہ سلطنت کے نیک سیرت آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت اور ملک کے بگڑتے ہوئے حالات کا بخوبی علم تھا لیکن ان پر قابو حاصل کرنا بس میں نہ تھا، ارباب اقتدار اور محبان وطن دونوں اس صورتحال سے سخت پریشان تھے، ان کی دلی خواہش تھی کہ انگریزوں کو ہندوستان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکال باہر کیا جائے، اس مقصد کے حصول کیلئے ۱۸۵۷ء میں آخری بار کوشش کی گئی کہ سلطنت مغلیہ کی مٹی ہوئی عظمت اور کھوئے ہوئے وقار کو بحال کیا جائے لیکن ملک دشمن عناصر اور انگریزوں کی شاطرانہ چالوں کی وجہ سے کامیابی نہ ہوئی، مسلمانوں کو سخت ہزیمت ہوئی، بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر لیا گیا، انگریزوں نے ایسی تباہی مچائی اور ایسے مظالم ڈھائے جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ان افراد کو خاص طور پر ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا جو مغلیہ سلطنت کے وفادار تھے یا کسی نہ کسی اعتبار سے حکومت کے حامی و مددگار تھے، مسلمانوں کیلئے تمام راستے تقریباً مسدود ہو چکے تھے، چاروں طرف گھٹاٹوپ اندھیرا

تھا، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں اور کدھر جائیں، معاش کے مواقع ناپید ہوتے جا رہے تھے، بعض لوگوں کی مفلوک الحالی کا یہ عالم تھا کہ پیٹ بھرنے اور تن ڈھاپنے کیلئے اپنے گھر کے برتنوں اور پالتو پرندوں کو فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لئے فطری طور پر وہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کو اپنا حریف سمجھ کر انہیں ظلم و زیادتی کا نشانہ بنا رہے تھے، مغلیہ سلطنت کے دیگر مخالفین نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنے مفادات کے پیش نظر انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ردِعمل کے نتیجہ میں مسلمانوں کے دلوں میں بھی انگریزوں کے خلاف شدید غم و غصہ کا لاوا ابل رہا تھا کیونکہ انگریز ہی ان کی تباہی و بربادی کے ذمہ دار تھے، مسلمانوں کو ہر اس چیز سے نفرت ہو گئی جس کا تعلق انگریزوں سے تھا، انتہا یہ تھی کہ انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کرنا بھی اکثر مسلمانوں نے شرک سمجھ لیا، اس کے علی الرغم غیر مسلم انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کر کے کلیدی عہدوں پر فائز ہو کر ملک کے نظم و نسق میں اہم کردار ادا کرنے لگے، ادھر شکست خوردہ مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ ماضی کی یادوں میں گم، حال سے بے خبر اور مستقبل سے لاتعلق آنکھیں بند کیے دن پورے کر رہے تھے۔

اس وقت برصغیر ہند کے مسلمانوں کو ایک ایسے رہبر کی ضرورت تھی جو صحیح معنوں میں ان کی رہنمائی کر سکے، خوش قسمتی سے انہیں سر سید احمد خاں ایسا

رہنما مل گیا جس کی بصیرت اور دور اندیشی نے مسلمانوں کی تقدیر بدل کر رکھ دی اس طوفان کا رخ موڑ دیا جس نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اس سیلاب کو روک دیا جو مسلمانوں کو غرق کئے دے رہا تھا، اپنے مقصد کے حصول کیلئے سرسید احمد خاں نے دو نکاتی حکمت عملی اختیار کی، انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے معاندانہ رویہ میں تبدیلی پیدا کی جائے، چنانچہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ جنگ آزادی کے پس منظر سے انگریزوں کو آگاہ کیا۔ ان اسباب کی نشاندہی کی جن کی وجہ سے جنگ آزادی عمل میں آئی تھی۔ اس ضمن میں انہیں نمایاں کامیابی ہوئی اور انگریزوں کے رویہ میں تبدیلی نظر آنے لگی۔

سرسید احمد خاں نے ایک طرف مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے رویہ میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی تو دوسری جانب مسلم نوجوانوں کو جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی جدوجہد شروع کی تاکہ مسلمان بھی ملک کے نظم ونسق میں غیر مسلموں کے شانہ بہ شانہ مؤثر کردار ادا کرسکیں، یہی سبب تھا کہ انہوں نے مختلف تعلیمی اداروں اور انجمنوں کی داغ بیل ڈالی جن میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم کالج خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ تمام کوششیں مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کے روشن مستقبل کے لئے کی جارہی تھیں لیکن بعض تنگ نظر مذہبی شخصیتوں نے سرسید احمد خاں کی سخت مخالفت کی، انہیں تکفیر کا ہدف بنایا اور ان کے خلاف سعودی عرب اور بغداد سے کفر کے فتوے

حاصل کر کے ملک کے طول وعرض میں تقسیم کیے لیکن سرسید احمد خاں ان تمام مخالفتوں کے باوجود اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہے۔

سیاسی شعور بیدار کرنے کی غرض سے سرسید احمد خاں نے سیاسی میدان میں بھی مسلمانان ہند کی رہنمائی کی، مختلف سیاسی وسماجی انجمنیں قائم کیں جو سیاسی بیداری کے عمل کو آگے بڑھاتی رہیں، ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام درحقیقت سرسید احمد خاں کی ان سیاسی سرگرمیوں کا ثمر تھا جنہیں وہ اپنی زندگی میں انجام دے چکے تھے۔ مسلم لیگ قائم تو ہوگئی لیکن مسلمانان ہند من حیث القوم ایک پلیٹ فارم پر جمع نہ ہوسکے، وہ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے، سیاسی نظریات وخیالات میں ہم آہنگی نہ تھی، ان میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو کھلم کھلا آل انڈیا کانگریس کا ہمدرد وہمنوا تھا، مسلم لیگ کے پاس وسائل بہت کم اور مسائل بہت زیادہ تھے، حالات کو سازگار بنانے کیلئے اس وقت ایک ایسے قائد کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جارہی تھی جو مسلمانوں کی شیرازہ بندی کرکے انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کرسکے اور ان کے مستقبل کو روشن اور تابناک بناسکے۔ قدرت نے اس کام کے لئے قائداعظم محمد علی جناحؒ کو منتخب کیا، مسلم لیگ کی قیادت قائداعظمؒ کے ہاتھوں میں آئی تو اس میں ایک نئی روح پڑگئی، ایک نیا ولولہ پیدا ہوگیا اور وہ مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے اس مقام پر پہنچ گئی کہ ۱۹۳۷ء کے الیکشن میں حصہ لے کر اپنے

وجود کو ثابت کر سکے۔

اس میں شک نہیں کہ قائداعظمؒ کی رہنمائی میں مسلم لیگ کی ہر دلعزیزی اور قوت میں برابر اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا لیکن الیکشن میں اسے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی اور صرف چند نشستیں حاصل ہوئیں، مسلم لیگ کی ناکامی پر کانگریسی حلقے بغلیں بجانے لگے اور آل انڈیا کانگریس کا یہ دعویٰ کہ وہی ملک کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت ہے بادی النظر میں درست نظر آنے لگا، پنڈت جواہر لال نہرو نے الیکشن کے نتائج پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس وقت انتہائی تکبر و غرور کے ساتھ بانگ دہل اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں، ایک حکومت برطانیہ اور دوسری آل انڈیا کانگریس۔

نہرو کا یہ اعلان مسلمانان ہند کیلئے ایک کھلا چیلنج تھا جسے قائداعظمؒ نے قبول کیا اور للکار کر جواب دیا: ''نہیں! ملک میں ایک تیسری جماعت بھی ہے جس کا نام ملت اسلامیہ ہے''، قائداعظمؒ کے اس دلیرانہ جواب نے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی، مسلم لیگ کی ہر دلعزیزی میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی اور چند برسوں میں قائداعظمؒ کی ولولہ انگیز قیادت کے نتیجے میں مسلم لیگ ہندوستان میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بن گئی۔

مسلم لیگ کے قیام کا مرکزی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کا ہر سطح پر تحفظ کیا جائے لیکن مسلمانوں کی جانب سے وقتاً فوقتاً جو مطالبات پیش

کیے گئے آل انڈیا کانگریس نے انہیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ کانگریسی لیڈران کی ہٹ دھرمی اور تنگ نظری کی وجہ سے کوئی سیاسی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ مسلمانان ہند کے حقوق پامال ہوتے رہے۔ ۱۹۳۷ء کے الیکشن میں کامیابی کے بعد کانگریس نے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اپنی حکومت قائم کی اور اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ اس کے پیش نظر مسلمانوں کا مفاد نہیں ہے۔ کانگریس نے اس وقت اپنے دور حکومت میں مسلمانوں پر جو زیادتیاں روا رکھیں پیرپور رپورٹ ان کی آئینہ دار ہے۔ کانگریسی لیڈران کی عصبیت، کوتاہ بینی، تنگ نظری اور ان کی غیر دانشمندانہ پالیسیوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ انہیں یقین ہو گیا کہ کانگریس ان کے حقوق کبھی تسلیم نہیں کرے گی اور اگر انگریزوں سے آزادی مل جانے کے بعد حکومت کی باگ ڈور مستقل طور پر کانگریس کے ہاتھ میں آ گئی تو مسلمانوں کا مستقبل ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تاریک ہو جائے گا۔ اس احساس نے مسلمانوں کے سیاسی شعور اور سیاسی بیداری میں زبردست اضافہ کیا۔ قائداعظمؒ نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے روشن مستقبل کی ضمانت اسی میں ہے کہ وہ اپنے لئے ایک علیحدہ آزاد، خودمختار اسلامی مملکت قائم کریں۔

اس مقصد کے حصول کے لئے لازم تھا کہ اپنے مطالبہ کو باضابطہ طور پر پیش کیا جائے اور اسے تسلیم کروانے کے لئے پوری قوت کے ساتھ جدوجہد کی جائے، چنانچہ لاہور کے تاریخی شہر میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقع

پر تیئس مارچ ۱۹۴۰ء کو ایک ریزولیشن کے ذریعہ اس مطالبہ کو باقاعدہ طور پر پیش کر دیا گیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء تحریک پاکستان کا سنگ میل ہے یہی وہ تاریخ ہے جب برصغیر ہند کے مسلمانوں نے اپنی منزل کا تعین کیا۔ یہی وہ تاریخ ہے جب انہوں نے اس گوہر مقصود کو حاصل کر لینے کا عزم کیا جو اُن کا مقدر بن چکا تھا۔ لاہور میں تعمیر کردہ مینار پاکستان آج آزادی کے اس سفر کی یاد دلا رہا ہے جسے مسلمانان ہند نے منزل بہ منزل طے کرتے ہوئے ایک آزاد اور خود مختار مملکت قائم کر کے ایک ایسا شاندار کارنامہ انجام دے ڈالا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔

قرارداد پاکستان
سرسید احمد خاں کی جدوجہد کے آئینہ میں

۱۸۵۷ء میں آخری بار کوشش کی گئی کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے اور مغلیہ سلطنت کی ڈوبتی کشتی کو بچالیا جائے لیکن سب تدبیریں الٹی ہوگئیں۔ سلطنت کی وفادار فوج کو عبرتناک شکست ہوئی انگریز ملک کے مالک ومختار بن بیٹھے۔ مغلیہ سلطنت کا چراغ ہمیشہ کیلئے گل ہوگیا۔ چاروں طرف تاریکی چھا گئی، خصوصاً مسلمانان ہند کے لئے دنیا اندھیر ہوچکی تھی۔ دہلی اور اس کے گردوپیش کے حالات دگرگوں تھے نفسانفسی کا عالم تھا، جائے پناہ کی متلاشی مارے مارے پھر رہے تھے، انہیں اپنی جان بچانا مشکل ہورہا تھا۔ ایک عجیب بے کسی اور بے بسی کا عالم تھا مایوسی اور شکست خوردگی کے آثار ہر طرف نمایاں تھے۔ مصیبت کے مارے الامان والحفیظ کی صدائیں بلند کررہے تھے۔

مسلمانان ہند کی اس تباہی وبربادی کا اصل سبب آپس میں مکمل اتحاد واتفاق اور یکجہتی کا فقدان تھا۔ جنگ آزادی کے بعد شیرازہ مزید بکھر گیا،

تعصب، تنگ نظری اور عاقبت نا اندیشی کے عفریت نے ایک ایسے گروہ کو جنم دیا جو ہر قیمت پر انگریزوں سے برسر پیکار رہنا چاہتا تھا، اس کے دل میں آتش انتقام بدستور بھڑک رہی تھی، انگریزوں کی ہر چیز سے اسے نفرت تھی۔ حد یہ ہے کہ انگریزی زبان سیکھنا اوراس کے ذریعہ جدید علوم میں دسترس حاصل کرنا کفر والحاد سے کم نہ تھا باقی مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ ان کی زبان گنگ اور قوت عمل زائل ہوکر رہ گئی تھی۔ خونی انقلاب اور غیر متوقع شکست نے دل ودماغ کو ماؤف کردیا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے ختم ہوکر رہ گئی۔ مسلمانان ہند سخت ذہنی دباؤ کا شکار ہوگئے۔ زندگی بسر کرنا محال نظر آرہا تھا، حسرت ویاس کے عالم میں اپنے اجڑنے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ کوئی ہمدرد وہمنوا نہ تھا کہ انہیں سہارا دے۔

اپنی فتحیابی کے بعد انگریزوں نے جبروتشدد کا بازار گرم کردیا۔ سلطنت مغلیہ کے حامیوں بالخصوص مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔ ان سے چن چن کر بدلے لئے جارہے تھے۔ سابقہ سلطنت سے پرخاش رکھنے والوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کو کچلنے میں انگریزوں سے بھرپور تعاون کیا۔ مسلمان قعر مذلت میں گر چکے تھے۔ ان کے کھوئے ہوئے وقار، مٹی ہوئی عظمت کو بحال کرنا بہ ظاہر ممکن نہیں تھا لیکن وقت کا تقاضہ تھا کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کو ملک کی دوسری قوموں کے شانہ بہ شانہ شاہراہ ترقی پر گامزن کرنے کے لئے کوشش کی جائے، اس مقصد کے حصول کیلئے ایک صاحب بصیرت عظیم رہنما کی ضرورت تھی۔ خوش قسمتی سے مسلمانان ہند کو

سرسید احمد خاں جیسا رہبر بروقت میسر آگیا جوان کی رہنمائی کے لئے بھرپور صلاحیت رکھتا تھا۔

سرسید احمد خاں حالات کا بغور مشاہدہ کررہے تھے۔انہیں یقین تھا کہ اگر ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کیلئے فوری اقدامات نہ کئے گئے توان کا مستقبل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریک ہوکر رہ جائے گا چنانچہ مسلمانوں کے مستقبل کو تابناک بنانے کیلئے انہوں نے ایک ایسی حکمت عملی وضع کی اور ایک ایسا لائحہ عمل تیار کیا جس کے خوش آئند نتائج تھوڑے ہی عرصے بعد ظاہر ہونا شروع ہوگئے۔سرسید احمد خاں نے سب سے پہلے منافرت کی اس دیوار کو گرانے کا بیڑا اُٹھایا جو مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان حائل ہوچکی تھی، اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ان کے شکوک وشبہات کو دور کرنے کی کوشش کی جو فریقین کے دلوں میں موجود تھے۔انگریزوں کو صحیح صورتحال سے آگاہ کرنے کیلئے ''اسباب بغاوت ہند'' نامی کتاب تحریر فرمائی۔مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ مصالحت کا راستہ اختیار کریں تا کہ فلاح و بہبود کیلئے راہ ہموار ہو سکے۔سرسید احمد خاں کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔انگریزوں کے رویہ میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہونے لگی اور معتوب مسلمانوں پر جو ظلم وستم ڈھائے جارہے تھے ان میں وہ شدت نہ رہی جو جنگ آزادی کے بعد دیکھنے میں آرہی تھی۔

اس طرح ایک ایسی فضا فراہم ہوگئی جس میں ہندوستان کے مسلمانوں کو سکون کے ساتھ سانس لینے کا موقع ملا لیکن انگریزی تعلیم سے نابلد

ہونے کی وجہ سے ملک کے نظم ونسق میں وہ کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر پا رہے تھے اس لئے ضروری تھا کہ وہ بھی جدید تعلیم سے بہرہ ور ہو کر ملک کی دیگر اقوام کے دوش بدوش ترقی کر سکیں۔ سر سید احمد خان نے اس سلسلہ میں اپنی مہم کا آغاز کیا تو تنگ نظر مولویوں اور ملاؤں نے ان کی مخالفت شروع کر دی۔ آسمان سر پر اٹھالیا انہیں کافر قرار دیا۔ مکہ اور بغداد سے بھی کفر کے فتوے حاصل کئے، مخالفین کے حامی اخباروں اور جریدوں نے بھی سر سید احمد خاں کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن انہوں نے پرواہ نہ کی اور اپنے مشن کو پورے جوش وجذبہ کے ساتھ جاری رکھا۔ مختلف تعلیمی اداروں کی داغ بیل ڈالی جس میں مسلم کالج سرفہرست تھا جو تقریباً چالیس سال بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بن گیا، افسوس کہ اپنے قائم کردہ کالج کے اس عروج کو دیکھنے کے لئے خود سر سید احمد خاں اس دنیا میں موجود نہ تھے، تحریک پاکستان میں اس یونیورسٹی کے طلبا نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ مسلمانان ہند کی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔

سر سید احمد خاں نے مسلمانان ہند کی یکجہتی اور شیرازہ بندی کیلئے بھی ہر ممکن کوشش کی۔ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس اور بعض دیگر ادارے قائم کر کے مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کیا۔ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام دراصل سر سید احمد خاں کی جدوجہد کا ثمر تھا جو ان کی وفات کے بعد حاصل ہوا۔ برصغیر ہند کے مسلمان اپنی ایک قومی سیاسی جماعت قائم کرنے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن وسائل کی کمی اور بعض نامساعد حالات کے باعث عرصہ دراز تک وہ

مقام حاصل نہ کر سکے جو اس کی حریف جماعت آل انڈیا کانگریس نے حاصل کرلیا تھا۔

۱۹۳۷ء کے الیکشن میں آل انڈیا مسلم لیگ کی کارکردگی مایوس کن تھی، بمبئی (حال ممبئی) اور یو۔پی میں قدرے کامیابی ہوئی باقی تمام صوبوں میں شکست کا سامنا ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کانگریسی حکومت تشکیل دینے کے لئے لکھنؤ تشریف لائے تو الیکشن میں کامیاب ہونے والے دو مسلم لیگی رہنماؤں سے گفت وشنید کی اور انہیں ترغیب دی کہ اگر وہ کانگریس کے پروگرام کی غیر مشروط حمایت کریں تو انہیں حکومت میں شامل کرلیا جائیگا۔

وزارت کی پیشکش نے دونوں مسلم لیگی رہنماؤں کو کانگریس کا حلیف و حامی بنا دیا اور انہوں نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے دونوں مسلم لیگی رہنماؤں کے نام اپنی سفارشات کے ساتھ جواہر لال نہرو کو بھیج دیئے، مولانا آزاد کو قوی امید تھی کہ مسلم لیگ کے ان دونوں رہنماؤں کو کانگریس کی حکومت میں شامل کرلیا جائے گا لیکن پنڈت جی ان میں سے صرف ایک کو حکومت میں شامل کرنے پر رضامند ہوئے، نہرو کی اس پیشکش کو دونوں مسلم لیگی رہنماؤں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس طرح مولانا آزاد کی یہ حکمت عملی کہ مسلم لیگ کے ان دو رہنماؤں کو کانگریس حکومت میں شامل کر کے یوپی میں مسلم لیگ کو گویا ختم کر دیا جائے ناکام ہوگئی۔

۱۹۳۷ء کے الیکشن میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ناکامی پر کانگریسی

حلقوں میں خوشیاں منائی گئیں اس کے رہنما بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے تمکنت وتکبر کے ساتھ اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں ایک حکومت برطانیہ اوردوسری آل انڈیا کانگریس۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ نے پنڈت نہرو کے اس دعویٰ کو چیلنج کرتے ہوئے ببانگ دہل اعلان کیا کہ ہندوستان میں ایک تیسری پارٹی بھی ہے اوراس کا نام ملت اسلامیہ ہے۔ قائداعظمؒ کے اعلان نے برصغیر ہند کے مسلمانوں میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کردیا۔ وہ اپنی تنظیم نو کی طرف متوجہ ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے آل انڈیا مسلم لیگ تیزی کے ساتھ ترقی کرنے لگی۔ قائداعظمؒ کی قیادت میں اس کی ہردلعزیزی اورقوت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے تاریخی شہر میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس میں ۲۳ مارچ کو قرارداد منظور کی گئی کہ ہندوستان کے شمال مغرب اور مشرق میں وہ علاقے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں ایک علیحدہ آزاد اور مختار مملکت قائم کی جائے، یہ قرارداد، پاکستان ریزولیشن، قرارداد پاکستان، لاہور ریزولیشن اور قرارداد لاہور کے نام سے یاد کی جاتی ہے، اس قرارداد میں لفظ ''پاکستان'' شامل نہیں تھا لیکن یہی قرارداد مطالبہ پاکستان کی بنیاد قرار پائی، یہی قرارداد برصغیر ہند کے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد خودمختار علیحدہ مملکت کے قیام کا ذریعہ بنی، اس قرارداد نے مسلمانان ہند کیلئے ایک درخشاں منزل متعین کردی، یہی قرارداد ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں آل انڈیا مسلم لیگ کا منشور بن گئی۔ اس قرارداد کو مسلم

لیگ کے کھلے اجلاس میں شیر بنگال اے۔ کے۔ فضل الحق نے پیش کیا اور چوہدری خلیق الزماں نے پرزور الفاظ میں تائید کی، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سر سید احمد خاں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی خوشحالی، ترقی اور سیاسی بیداری کیلئے جو شاندار خدمات انجام دی ہیں انہیں پیش نظر رکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قرارداد پاکستان دراصل سر سید احمد خاں کی پر خلوص اور انتھک جدوجہد کا منطقی نتیجہ تھی۔

حصہ سوئم

پاکستان کا وجود

آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد

شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کی بنیادیں کمزور ہوگئیں۔ ۱۸۵۷ء میں آخری مرتبہ کوشش کی گئی کہ بے جان مغلیہ سلطنت میں جان پڑ جائے، ڈوبتی کشتی سنبھل جائے لیکن عدم اتحاد و یکجہتی اور بداعمالیوں کا نتیجہ تھا کہ تمام کوششیں رائیگاں ہوگئیں۔ شمع بھڑکی اور خاموش ہوگئی۔ وہی انگریز جو تجارت کیلئے ہندوستان آئے تھے ملک کے مالک و مختار بن بیٹھے۔ ناکام جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی، مسلمان اپنا سب کچھ داؤ پر لگا چکے تھے۔ بدقسمتی سے پانسہ ان کے خلاف پڑا اور وہ بازی بری طرح ہار گئے، ان کے پاس کچھ باقی نہ رہ گیا۔ ایک عجیب پراگندگی کا عالم تھا شکست خوردگی اور مایوسی کے آثار ہر طرف نمایاں تھے۔ تباہی اور مکمل تباہی مسلمانوں کا مقدر بن چکی تھی، ادھر انگریزوں نے پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں پر جبر و تشدد شروع کر دیا۔ فطری طور پر انہیں خیال تھا کہ ناکام جنگ آزادی کے ذمہ دار صرف مسلمان ہیں زمانہ کی رفتار کو دیکھتے ہوئے اور اپنے مفاد کے پیش نظر ہندوستان کی دیگر اقوام نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا۔ مسلمانوں کی تہذیب کو فنا کرنے اور

ان کی زبان کو مٹانے کی کوشش کی گئی، غرض مسلمانوں پر ہر طرح مظالم توڑے گئے اور انہیں مکمل طور پر تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں ایک دوسرے سے تیز دوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ دونوں کی منزلیں مختلف تھیں۔ غیر مسلم شاہراہ ترقی پر گامزن تھے اور مسلمان تباہی و بربادی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

سرسید احمد خاں نے خطرے کو محسوس کیا۔ انہوں نے اس طوفان کو جو مسلمانوں کو قعر مذلت میں دھکیلے دے رہا تھا روکنے کی جدوجہد شروع کی اور انہیں اپنی کوششوں میں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی لیکن سیاسی تسلط بدستور قائم رہا، سیاسی اعتبار سے مسلمان بدستور پیچھے رہے۔ ان کی کوئی سیاسی تنظیم نہ تھی۔ کوئی مضبوط اور منظم سیاسی جماعت نہ تھی۔ ان کے سامنے کوئی مقصد نہ تھا۔ کوئی منزل نہ تھی۔

۱۹۳۷ء کے صوبائی الیکشن نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ مسلمان سیاسی طور پر متحد نہیں ہیں۔ اس الیکشن میں مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والی جماعت مسلم لیگ کو شکست فاش ہوئی، کانگریس کی دلی آرزو پوری ہوئی، اسے اپنے خواب کی تعبیر مل گئی، ہر کانگریسی مسرور و شاداں تھا۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی، غرور اور تکبر کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ "ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں ایک کانگریس اور دوسری حکومت برطانیہ"۔ پنڈت نہرو برصغیر ہند کے مسلمانوں کو قطعاً فراموش کر چکے

تھے۔وہ سمجھ رہے تھے کہ مسلمانوں میں زندگی کے آثار ختم ہو چکے ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمانوں کا شیرازہ بکھر چکا تھا، ان کے سامنے کوئی واضح لائحہ عمل نہ تھا۔ مسلم سیاسی حلقوں میں مایوسی کے آثار نمایاں تھے۔ مسلمان سیاسی طور پر یتیم نظر آرہے تھے، ایسے ناسازگار حالات میں قائداعظمؒ نے امید کا دامن نہ چھوڑا۔ آپ نے پنڈت نہرو کو فوراً ٹوکا اور للکار کر کہا ''نہیں ہندوستان میں ایک تیسری جماعت بھی ہے اور اس کا نام ملت اسلامیہ ہے.........'' قائداعظمؒ کے ان الفاظ نے قوم کو ایک نئی زندگی بخش دی مسلمانوں کے خوابیدہ احساسات جاگ اٹھے، ہر طرف نئی زندگی کے آثار نظر آنے لگے، ایک تیسری پارٹی اپنے وجود کو ناقابل انکار حقیقت بنانے کا عزم کر چکی تھی، ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اس منزل کا تعین بھی ہو گیا جہاں مسلمانوں کو پہنچنا تھا۔ اب مسلمانوں کے سامنے اپنا ایک واضح سیاسی لائحہ عمل اور سیاسی مسلک موجود تھا۔

قائداعظمؒ نے جب مطالبہ پاکستان پیش کیا تو غیر مسلموں کا ذکر ہی کیا بہت سے مسلمانوں نے بھی اس کا مذاق اڑایا اور اسے ناممکن العمل بتایا لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا اس کی اہمیت واضح ہوتی گئی اور یہ مطالبہ زور پکڑتا گیا۔ مطالبہ پاکستان کو کمزور بنانے کی غرض سے کانگریسی لیڈران مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کرنے لگے، انہیں آپس میں لڑانے اور ان کا شیرازہ بکھیرنے کے لئے ہر ممکن ذرائع استعمال کئے گئے۔ وہ صوبے جہاں مسلمان اکثریت میں تھے اور اکثریت میں ہونے کی وجہ سے اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے

تھے کانگریس کی تخریبی کارروائیوں کے خاص مراکز بن گئے اور غیر مسلموں کے بڑے بڑے کارخانوں کی دولت کو ان تخریبی کارروائیوں کے لئے وقف کردیا گیا۔

۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں مسلم نشستوں کے حصول کے لئے کانگریس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اکھنڈ بھارت قائم کرنے کیلئے مسلم اتحاد کو ختم کردینا ضروری اور بہت ضروری ہے۔ کانگریس نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ فائدہ اسی میں ہے کہ مسلمانوں کو فریب دے کر اور انہیں بے وقوف بنا کر تباہ و برباد کردیا جائے لیکن کامیابی کی کوئی صورت نہ دکھائی دی تو وہی نہرو جو ۱۹۳۷ء میں مسلمانوں کے وجود سے انکار کررہے تھے ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کے تاریخی الیکشن میں مسلمانوں کی نمایاں کامیابی پر حیرت زدہ تھے۔ ۱۹۴۰ء میں مطالبہ پاکستان پیش کرنے والی جس جماعت کا مذاق اڑایا جارہا تھا وہ اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ گئی تھی ۱۹۴۷ء میں خواب حقیقت بن گیا، امید یقین میں بدل گئی، قائداعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں مسلمانوں نے پاکستان حاصل کرکے دنیا کی تاریخ میں ایک سنہرے باب کا اضافہ کردیا۔

چودہ اگست ہماری تاریخ میں ایک مبارک دن ہے۔ یہ وہ دن ہے جب ہم نے اپنی گردن سے طوق غلامی اتار پھینکا، یہ وہ دن ہے جب ہم نے برطانوی شہنشاہیت اور کانگریسی سامراجیت دونوں کو بیک وقت سرنگوں کردیا، یہ

وہ دن ہے جب ہماری دس سالہ جدوجہد کا ثمر ملا، یہ وہ دن ہے جب ہم نے شاعر مشرق علامہ اقبال کے خواب کو شرمندہ تعبیر بنایا، یہ وہ تاریخ ہے جب ہم نے ایک طالبعلم کی ''بکواس'' کو حقیقت کر دکھایا۔ مجھے چودہ اگست ۱۹۴۷ء کی وہ تاریخ یاد آ رہی ہے جب ہمارا عزیز وطن عالم وجود میں آیا تھا۔ وہ وقت مسلمانوں کیلئے بڑا نازک تھا۔ بھارتی حکومت کے ستائے ہوئے اور لٹے لٹائے خانماں برباد مسلمان جوق در جوق پاک سرزمین کی طرف چلے آ رہے تھے۔ اس تاریخی ہجرت کے نتیجہ میں نہ معلوم کتنی ماؤں کی گودیں سونی ہوگئیں، ہزاروں اور لاکھوں عورتوں کی مانگ اجڑ گئی، لاتعداد بچے یتیم اور ہماری بہتیری عصمت مآب بہنیں اور بیٹیاں غیر مسلموں کی درندگی اور ہوسکاری کا شکار ہوگئیں، غرض ایک عجیب بے سروسامانی کا عالم تھا۔ کراچی میں مہاجرین اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ ان کے سر چھپانے، پیٹ بھرنے اور تن ڈھاپنے کا معقول انتظام نہ تھا، حکومت کے ذرائع محدود تھے، مسلمانوں کیلئے موت اور زندگی کا سوال تھا، دشمنان اسلام سمجھ رہے تھے کہ پاکستان نیست و نابود ہو جائے گا، قوم سراسیمہ و پریشان تھی۔ نباض قوم محمد علی جناحؒ نے اپنے اور غیروں کے دلوں کی آوازیں سنیں، سفینۂ امت کے ناخدا نے اپنے آہنی عزم و یقین کے ساتھ اعلان کیا: "Pakistan Has Come To Stay" پاکستان قائم رہنے کیلئے وجود میں آیا ہے۔ قائداعظمؒ کے ان الفاظ نے دشمنان اسلام کی آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا، قوم میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی جن لوگوں کو پاکستان کے استحکام میں شک تھا

انہیں یقین ہو گیا کہ پاکستان قائم و دائم رہے گا۔

ہندوستان کے مسلمان اپنا سب کچھ کھو کر آئے تھے لیکن قائداعظمؒ نے دس سال قبل جو سرمایہ زندگی عطا کیا تھا وہ بدستور ان کے سینوں سے لگا رہا۔ ان کے پاس اتحاد، یقین محکم اور مکمل تنظیم تھی۔ اس وقت صوبائی تعصب دکھائی نہ دیتا تھا، پنجابی، بنگالی، سندھی، بلوچی اور پٹھان کی تفریق نظر نہ آئی تھی، لوگوں کے سامنے ذاتی مفاد نہیں تھا۔ غم واندوہ کے مارے ہوئے مسلمانوں نے اپنے وطن عزیز کی بقا، استحکام اور ترقی کیلئے تن من دھن کی بازی لگا دی۔ ہر شخص عمل پیہم میں منہمک نظر آ رہا تھا، ایک عجیب ولولہ تھا، ایک عجیب جوش وخروش تھا۔ کوئی عہد کر رہا تھا کہ وہ کبھی رشوت نہ لے گا، کوئی قسم کھا رہا تھا کہ وہ ایک سچے مسلمان کی زندگی بسر کرے گا۔ ہر کس و ناکس اپنی مملکت کو ایک معیاری فلاحی سلطنت دیکھنا چاہتا تھا۔ ذاتی مفاد کو قومی مفاد کے بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔ بعض دفاتر میں لوگ زمین پر بیٹھ کر کام کر رہے تھے، ہر شخص اپنے فرائض منصبی کو ایمانداری، خلوص اور محنت کے ساتھ انجام دے رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی، برسوں کا کام مہینوں اور مہینوں کا کام دنوں میں انجام پانے لگا اور ایک سال سے بھی کم مدت میں اس طوفان کا منہ موڑ دیا گیا جو پاکستان کی سالمیت کیلئے خطرہ بن کر آیا تھا۔ پاکستان کی بنیادیں بتدریج گہری ہوتی چلی گئیں۔ دشمنوں نے ہماری کامیابی و کامرانی کو بغض وحسد سے دیکھا اور دوستوں نے خراج تحسین پیش کیا۔ یہ ہمارے اتحاد، یقین محکم اور ہماری تنظیم کا نتیجہ تھا کہ

ہم نے وہ کام سرانجام دے دیا جو دشوار ہی نہیں بلکہ بہت دشوار تھا............لیکن چند سال بعد حالات نے ایک نئی کروٹ لی، تقدیر کا پانسہ پلٹ گیا۔ قائداعظمؒ اور قائد ملت کے بعد تباہی کی منزل کی طرف ہم اسی تیزی سے بڑھنے لگے جس تیزی کے ساتھ ہم شاہراہ ترقی پر گامزن رہ چکے تھے۔ ہمارا شیرازہ بکھرنے لگا، ہمارا اتحاد ختم ہوتا چلا گیا۔ ہماری تنظیم ٹوٹ گئی، ہمارا یقین محکم متزلزل ہوگیا، ہمارے ولولے سرد پڑ گئے، ہم میں صوبائی، لسانی اور مذہبی تعصب پھر عود کر آیا۔ بے غرضی کی جگہ خود غرضی نے لے لی۔ فرائض منصبی کی ادائیگی میں نیک نیتی، دیانت داری، ایمانداری اور خلوص کا فقدان ہوگیا۔ چور بازاری، رشوت ستانی عام ہوتی چلی گئی۔ جن لوگوں نے کبھی خراج تحسین پیش کیا تھا وہ ہماری تباہی و بربادی کا منظر حیرت واستعجاب سے دیکھ رہے تھے۔ تحسین وآفرین کی صدائیں بلند کرنے والے ہم پر نکتہ چینی کرنے لگے، ہمارے دشمن خوش ہو رہے تھے مضحکہ اُڑا رہے تھے، دنیا ہم کو ایک نااہل و ناکارہ قوم سمجھنے لگی تھی۔ اب ہم اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں سے ہمیں خود اپنی خبر نہیں آتی تھی، قوت مدافعت اور قوت اظہار کے ساتھ ساتھ ہماری قوت احساس بھی ختم ہوچکی تھی۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

حالات یقیناً مایوس کن ہوچکے ہیں لیکن اس بھیانک تاریکی میں

امید وبیم کی کرن بہرحال باقی ہے مرض شدت ضرور اختیار کر چکا ہے لیکن لاعلاج ہرگز نہیں ہے، ہم بے راہ ہو چکے ہیں لیکن گمراہ نہیں ہوئے، ہماری ذہنی اور دماغی صلاحیتیں ماند ضرور پڑ گئی ہیں لیکن فنا نہیں ہوئیں، ہمارے مٹے ہوئے جوہر پر پھر جلا ہو سکتی ہے، ہماری خوبیاں اب بھی اجاگر ہو سکتی ہیں، دبی ہوئی چنگاریوں کو پھر شعلہ بنایا جا سکتا ہے، آوارہ دشت غربت قوم کو نشان راہ پھر مل سکتا ہے لیکن یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب ہم آپس میں اتحاد و اتفاق اور اخوت کو جنم دیں، اپنے کردار کو بلند اور اعمال کو صالح بنائیں، قوم و ملک کی صحیح اور واقعی تعمیر کیلئے مسلسل جد و جہد کرتے رہیں۔

پاکستان زندہ باد

پاکستان کی قدر کیجئے

تحریک پاکستان سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ آل انڈیا کانگریس نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ پاکستان وجود میں نہ آنے پائے۔اس مہم میں مسلمانان ہند کی بعض جماعتیں بھی کانگریس کی حامی وہمنوا تھیں لیکن قائداعظمؒ کی سیاسی بصیرت کے سامنے کانگریس اور اس کی حلیف جماعتوں کی سب تدبیریں الٹی ہوگئیں۔تمام مخالفتوں اور معاندانہ پروپیگنڈے کے باوجود چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کی سب سے بڑی آزاد اور خود مختار اسلامی مملکت قائم ہوکر رہی۔

تقسیم ہند کے بعد لاکھوں غیر مسلم ان علاقوں سے جو پاکستان کا حصہ بن چکے تھے نقل مکانی کر کے ہندوستان چلے گئے پھر بھی پاکستان سے پرخاش رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد مصلحتاً یا مجبوراً پاکستان میں بدستور موجود رہی۔ ادھر ہندوستان میں مخالفین پاکستان کے سینوں میں جو آگ سلگ رہی تھی وہ شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔پاکستان سے ہندوستان پہنچنے والے اکثر وبیشتر شرنارتھی جلتی آگ پر تیل چھڑکتے رہے،نتیجہ یہ ہوا کہ بھارت کے مختلف شہروں میں مسلمانوں

کے خلاف ظلم وستم کی آندھیاں چلنے لگیں۔غضب ڈھانے والوں کو اس سے غرض نہ تھی کہ مغضوب کانگریس کا حامی تھا یا مخالف، پاکستان کا دشمن تھا یا نہیں، بلوائیوں کو تو بس یہ پڑی تھی کہ مسلمانوں کا نام ونشان مٹا دیا جائے۔جبر وتشدد کی ایسی لہر اُٹھی کہ لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آنے پر مجبور ہو گئے۔

ہندوستان سے آنے والے مہاجرین بلاشبہ پاکستان کے پرستار تھے۔ اپنا سب کچھ لٹا کر مملکت خداداد آئے تھے۔پاکستان کیلئے ان کی قربانیاں اپنی مثال آپ تھیں حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ مہاجرین پاکستان پہنچ کر اس کے نظم ونسق کو نہ سنبھالتے تو ممکن تھا کہ اس ملک کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا۔ان سرفروشوں پر پاکستان جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔پاکستان میں آنے والے مہاجرین کو جس جوش وجذبہ کے ساتھ مقامی حضرات نے خوش آمدید کہا تھا اور جس احسن طریقہ سے ان کی مدد کی تھی وہ ہماری تاریخ کا ایک ناقابل فراموش درخشاں باب ہے۔اس زمانہ کے بعض واقعات جو ہم تک پہنچے ہیں وہ تاریخ اسلام میں رقم کردہ ان واقعات کی یاد دلاتے ہیں جو سرورِ کونین ﷺ کی ہجرت کے بعد مدینہ میں مہاجر وانصار کے مابین پیش آئے تھے۔کاش وہ خوشگوار فضا جو پاکستان کے قیام کے وقت مقامی حضرات ومہاجرین کے درمیان قائم ہوئی تھی کبھی آلودگی کا شکار نہ ہوتی۔

مہاجرین کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے افراد بھی پاکستان پہنچ گئے جو آل انڈیا کانگریس کے ہم خیال تھے۔جن کا نصب العین پاکستان کی مخالفت رہ

چکا تھا، اس طرح منزل گویا انہیں بھی مل گئی جو تحریک پاکستان کے خلاف تھے، جب تک قائداعظمؒ زندہ رہے ملک میں موجود پاکستان کے مخالفین سر نہ اٹھا سکے لیکن بعد میں ان لوگوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ یہاں ان المناک واقعات کا ذکر مقصود نہیں ہے جو قائداعظمؒ کے انتقال کے بعد رونما ہوئے، ذکر کرنا ہے اس مذموم مہم کے بارے میں جو پاکستان کو مطعون کرنے کیلئے آج بھی جاری ہے، ناپختہ ذہنوں کو زہر آلود کرنے، اہل وطن کے جذبہ حب الوطنی کو دبانے اور ملک میں شکوک وشبہات کی فضا پیدا کرنے کی غرض سے پاکستان کے خلاف مختلف اعتراضات کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کی مجموعی آبادی جو آج کم وبیش چالیس کروڑ ہے ایک ایسی زبردست قوت ہوتی جو متحدہ ہندوستان میں اپنی بالادستی بہ آسانی منوا لیتی، یہ محض ایک مفروضہ ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو وہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب غیر مسلموں کے مقابلہ میں آج بھی تقریباً وہی رہتا جو پاکستان کے قیام سے پہلے تھا، اگر مسلمانان ہند اپنی بالادستی اس وقت نہ منوا سکے جب آل انڈیا کانگریس برسر اقتدار نہیں تھی اور بھارت حکومت برطانیہ کے زیر نگیں تھا تو اقتدار کانگریس کو منتقل ہونے کے بعد یہ کیونکر ممکن ہوتا کہ مسلمان اپنی بالادستی قائم کر لیتے، مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان کے سیاسی اور تاریخی پس منظر کو پیش نظر رکھا جائے

تو ہر صاحب فہم و ذکا تسلیم کرے گا کہ پاکستان کا مطالبہ ردعمل تھا ان محرومیوں کا جو برصغیر ہند کے مسلمانوں کو گھیرے ہوئے تھیں، مطالبہ پاکستان نتیجہ تھا ان ناانصافیوں اور حق تلفیوں کا جو کانگریس نے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی تھیں۔ اگر کانگریس مسلمانوں کے جائز حقوق سے چشم پوشی نہ کرتی تو شاید پاکستان کبھی قائم نہ ہوتا۔

قیام پاکستان سے قبل ہندوستان کے مسلمانوں کو ترقی کے وہ مواقع نہ مل سکے جو پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو آج حاصل ہیں۔ بالادستی تو بہت دور کی بات ہے۔ برصغیر ہند کے مسلمانوں کو اپنی آبادی کے تناسب کے اعتبار سے بھی زندگی کے اکثر و بیشتر شعبوں میں دسترس نہ تھی۔ تعلیم کے میدان میں ہندوستان کی دیگر اقوام کے مقابلہ میں مسلمان پس ماندہ تھے۔ من حیث القوم ان کی اقتصادی اور معاشی حالت تسلی بخش نہ تھی۔ ان کے جائز حقوق پامال کئے جارہے تھے۔ انتہا یہ تھی کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی مسلمان پسماندگی کا شکار تھے، ان حقائق کے باوجود یہ تصور کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو اکھنڈ بھارت میں مسلمان زیادہ خوشحال ہوتے خام خیالی کے سوا کچھ نہیں۔

یہ بات بھی بعید از حقیقت ہے کہ اگر پاکستان وجود میں نہ آتا تو بھارت میں مسلمانوں کو وہ مسائل پیش نہ آتے جن سے وہ دوچار ہوئے، اس میں شک نہیں کہ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو اچانک مختلف مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جس کیلئے وہ ذہنی طور پر تیار

نہیں تھے۔ برسر اقتدار آنے کے بعد کانگریسی حکومت نے زمینداری کا خاتمہ کر دیا۔ جس سے مسلمان سب سے زیادہ متاثر ہوئے کیونکہ زمینداری مسلمانوں کے معاش کا بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک اہم ذریعہ تھی۔ زمینداری ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اپنے ذریعہ معاش سے ہاتھ دھوبیٹھی مطلوبہ تعلیم سے محرومی کی بناپر بیروزگار ہونے والے مسلمانوں کے لئے ممکن نہ تھا کہ فوراً مناسب ملازمت حاصل کر سکتے، تجربہ اور سرمایہ پاس نہ ہونے کی وجہ سے تجارت اور صنعت وحرفت کے میدان میں بھی ان کے لئے پیش قدمی ممکن نہ تھی۔ غرض تقسیم ہند کے بعد ہزاروں مسلمانوں کیلئے بے روزگاری ایک سنگین مسئلہ بن گئی۔

منفی اندازفکر اختیار کرنا بہت آسان ہے، اعتراضات کرنے والوں کو سوچنا چاہئے کہ ''اگر پاکستان نہ بنتا'' کی منزل گذر چکی ہے۔ پاکستان ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، پاکستان قائم رہنے کیلئے وجود میں آیا ہے۔ اسے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ملک ہمارا اپنا وطن ہے، یہ ہماری پہچان ہے، اس سے ہماری عزت اور ہمارا وقار وابستہ ہے۔ اس کو تنقید کا ہدف بنانا زیب نہیں دیتا، اس سے پرخاش رکھنا جذبہ حب الوطنی کے منافی ہے، اگر ہمارے ملک کے حالات سازگار نظر نہیں آتے، اگر تعصب، تنگ نظری، لاقانونیت اور فرقہ واریت کے عفریت نے ہم کو لپیٹ رکھا ہے تو ہم خود اس کے ذمہ دار ہیں، اس کے لئے ملک کو مطعون کرنا نادانی ہے۔ اپنا اپنا محاسبہ کیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی

کہ ملک کے حالات بگاڑنے کی ذمہ داری خود ہمارے اوپر عائد ہوتی ہے۔ پاکستان نے ہم کو کیا کچھ نہیں دیا لیکن مادرِ وطن کو ہم نے کچھ بھی تو نہ دیا۔ پاکستان کے خلاف زہرافشانی کرنے والے یہ بھی نہیں سوچتے کہ ان کی بے جا تنقید نونہالان وطن اور خود ان کی اولاد کو کس ذہنی انتشار و اذیت میں مبتلا کردیتی ہے۔ جذبہ حب الوطنی کے بجائے ان کے دلوں میں مادرِ وطن سے کدورت اور نفرت پیدا ہوتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے مستقبل کے معمار بے یقینی کا شکار ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی زندگی بڑے کرب میں گزرتی ہے۔ ان کی شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ وطن میں رہتے ہوئے وہ اپنے آپ کو بیگانہ محسوس کرنے لگتے ہیں، عقل و خرد اور دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم ملک کے وسیع تر مفاد کو سامنے رکھیں، دوراندیشی سے کام لیں، اپنے بچوں کے روشن مستقبل اور ذہنی سکون کے خاطر فاسد خیالات کو دل سے نکال پھینکیں اور اپنے ملک کی قدر کریں، پاکستان سے پرخاش ہر اعتبار سے جذبہ حب الوطنی کے منافی ہے۔

اگر پاکستان وجود میں نہ آتا

مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں آل انڈیا کانگریس کے ساتھ مسلمانان ہند کی بعض مقتدر دینی اور سیاسی شخصیتیں شریک تھیں۔فرد کے مقابلہ میں جماعت زیادہ موثر کردار ادا کرسکتی ہے، چنانچہ کانگریس نے مسلمانوں کی چند مذہبی جماعتوں کو بھی سیاسی سطح پر اپنا ہم خیال بنالیا تھا۔مسلم اکثریتی صوبوں میں کانگریس کا خاص طور پر بڑا عمل دخل تھا۔تقسیم ہند سے قبل صوبہ سرحد میں کانگریس پارٹی برسر اقتدار تھی اور پنجاب میں اس کی بھرپور حمایت کے بل بوتے پر یونینسٹ پارٹی نے حکومت بنارکھی تھی لیکن سیاسی حالات نے ایسی کروٹ لی کہ کانگریس کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔مسلمانوں کی نمائندگی کے تمام دعوے صدا بہ صحرا ثابت ہوئے۔مسلم عوام کا سیلاب صوبہ سرحد کی کانگریسی حکومت کو بہا کرلے گیا اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی نے گھٹنے ٹیک دیئے۔کانگریس کی تمام سازشیں ناکام ہوگئیں۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد کانگریس کے ہزاروں ہمنوا بھارت چلے گئے لیکن مخالفین پاکستان کی ایک بڑی تعداد مجبوراً یا مصلحتاً ان علاقوں

میں بدستور موجود رہی جو پاکستان کا حصہ بن چکے تھے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل تھے۔ تقسیم ہند کے بعد بھارت کے مختلف علاقوں سے لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آتے رہے۔ ان مہاجرین میں بعض ایسی دینی اور سیاسی افراد بھی شامل تھے جو پاکستان سے پرخاش رکھتے تھے۔ اس طرح پاکستان کے مخالفین کے مختلف گروہ ایک گھاٹ پر جمع ہو گئے۔ قائداعظمؒ کی زندگی میں ان لوگوں کو کھل کھیلنے کا موقع نہ مل سکا لیکن ان کی آنکھ بند ہوتے ہی ناپختہ ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے اور عام لوگوں کے جذبہ حب الوطنی کو سبک بنانے کی غرض سے مملکت خداداد کے خلاف زہرافشانی کی جانے لگی۔

ایک اعتراض یہ کیا جانے لگا کہ اگر پاکستان قائم نہ ہوتا تو غیر منقسم ہندوستان میں مسلمان اجتماعی طور پر ایک ناقابل تسخیر قوت بن کر رہتے اور آج بھارت میں انہیں ایک کمزور اقلیت کی طرح بے بسی اور بے کسی کی زندگی نہ گذارنی پڑتی۔ یہ اعتراض محض ایک مفروضہ ہے۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ملک میں بے یقینی کی فضا پیدا کی جائے اور نئی نسل کے ان نوجوانوں کو جو تحریک پاکستان کے پس منظر سے زیادہ واقف نہیں ہیں ذہنی انتشار میں مبتلا کیا جائے۔

اگر بلند نظری کو اپنا شعار بنایا جائے، قومی مفادات کو ذاتی مفادات پر ترجیح دی جائے، تعصب اور تنگ نظری سے گریز کیا جائے، تاریخی حقائق کو سامنے رکھا جائے، فہم وفراست اور جذبہ حب الوطنی سے کام لیا جائے اور برصغیر ہند کے مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان کا مطالعہ کیا جائے تو ہر

صاحب فکر ونظر اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ مسلمانان ہند کی خوشحالی اور ترقی کیلئے پاکستان کا قیام ناگزیر تھا۔ اگر پاکستان وجود میں نہ آتا تو انہیں ترقی کے وہ مواقع میسر نہ ہوتے جو تقسیم ہند کے بعد حاصل ہوئے، قیام پاکستان سے قبل برصغیر ہند میں مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں کسی حد تک مناسب نمائندگی حاصل تھی لیکن زندگی کے دیگر تمام شعبوں میں ان کی نمائندگی تقریباً معدوم تھی، بینکوں، انشورنس کمپنیوں اور اسی قسم کے دیگر اداروں میں مسلم ملازمین بہت کم نظر آتے تھے۔ مسلمان سائنس دانوں، انجینئروں اور ڈاکٹروں کی تعداد انتہائی کم تھی۔ صنعت وحرفت اور تجارت میں ان کا کوئی قابل ذکر حصہ نہ تھا۔ مسلم اقلیتی صوبوں کا کیا ذکر مسلم اکثریتی صوبوں کے عموماً ہر شہر، قصبہ اور گاؤں میں صنعت وحرفت اور تجارت غیر مسلموں کے قبضہ میں تھی۔ ان تمام شعبوں میں مسلمانان ہند کا حصہ دال میں نمک کے برابر بھی نہ تھا۔

تعلیمی اعتبار سے بھی مسلمان ہندوستان کی دیگر اقوام کے مقابلہ بہت پسماندہ تھے۔ خاص طور پر مسلم اکثریتی صوبوں میں ان کی شرح خواندگی انتہائی کم تھی۔ مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کی حالت قدرے بہتر تھی لیکن ان صوبوں میں بھی دیگر اقوام کے مقابلہ میں بہت پیچھے تھے۔ خصوصاً اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ان کا گذر مشکل سے ہو پاتا۔ ایک عام تاثر یہ پیدا کر دیا گیا تھا کہ مسلمان حساب، بینکاری، انجینئرنگ، ڈاکٹری یا اسی نوع کے دیگر مضامین میں تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہ تاثر اس قدر پختہ ہو چکا تھا کہ خود

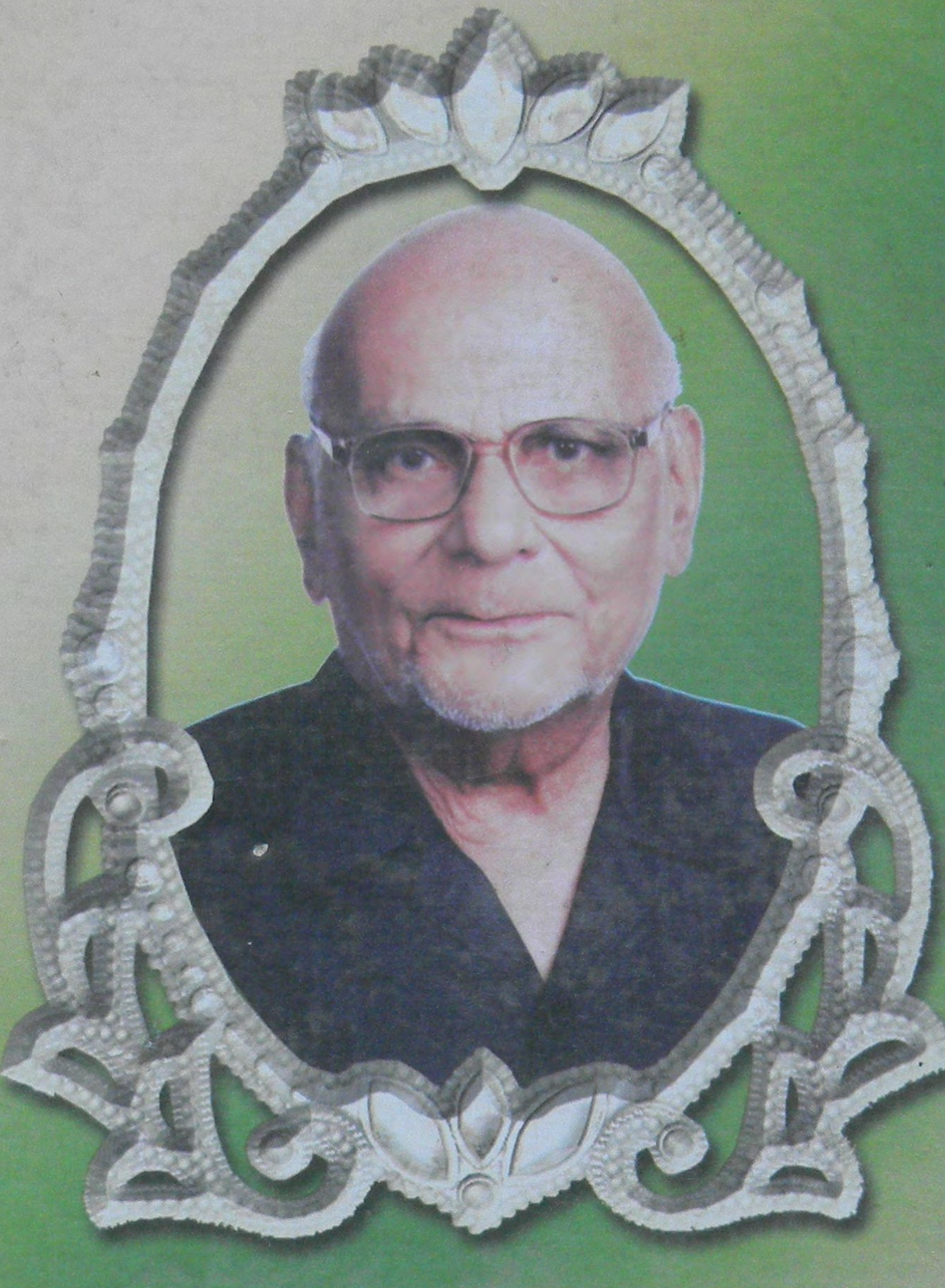
مسلمانان ہند کیلئے گویا یہ مضامین شجر ممنوعہ تھے۔ یہی سبب تھا کہ بینکوں اور اسی قسم کے دوسرے اداروں میں مسلمان ملازمین خال خال نظر آتے تھے۔ اگر سرکاری ملازمتوں، زمینداری اور ہندوستان کی مسلم ریاستوں کا سہارا نہ ہوتا تو رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آجاتا جب برصغیر ہند کے مسلمانوں کو تن ڈھانکنا اور پیٹ بھرنا مشکل ہو جاتا۔ اسی طرح صحافت میں بھی مسلمانوں کا کوئی خاص عمل دخل نہ تھا، چند اردو روزنامے، ماہنامے، پندرہ روزہ یا ہفتہ وار اخبارات ضرور شائع ہوتے تھے لیکن مسلم لیگ کے موقف کی ترجمانی کیلئے کوئی انگریزی روزنامہ نہ تھا۔ 'ڈان' پہلا انگریزی روزنامہ تھا جو برصغیر ہند کے مسلمانوں کے ترجمان کی حیثیت سے قیام پاکستان سے چند سال قبل منظر عام پر آیا۔ غرض تقسیم ہند سے قبل مسلمانان ہند ہر شعبہ زندگی میں پس ماندہ تھے۔ کیوں؟ کیا وہ فہم وفراست میں دوسری اقوام کے مقابلہ میں کم تر تھے؟ کیا ان میں ترقی کرنے کی صلاحیت مفقود تھی؟

ہرگز نہیں! مسلمانان ہند کسی اعتبار سے اپنے مدمقابل دوسری اقوام سے کمتر نہ تھے لیکن تقسیم ہند سے قبل انہیں ترقی کے وہ مواقع نہ مل سکے جو غیر مسلموں کو حاصل تھے اور جب پاکستان میں انہیں مناسب سہولتیں میسر ہوئیں تو انہوں نے ثابت کردیا کہ مسلمان صلاحیت میں کسی سے کم نہیں۔

اگر پاکستان وجود میں نہ آتا اور اکھنڈ بھارت قائم ہوجاتا تو مسلمانان ہند کی اپنی ایک آزاد، خود مختار مملکت نہ ہوتی، اپنا پرچم اور قومی ترانہ نہ ہوتا۔ اگر پاکستان قائم نہ ہوتا تو آج پاکستان میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان بینکار،

انجینئر، ڈاکٹر اور سائنسدان نہ ہوتے۔ کانگریس نے ماضی میں مسلمانوں کے حقوق کی جس طرح پامالی کی تھی اسکے پیش نظر یہ توقع کیونکر کی جاسکتی تھی کہ اکھنڈ بھارت کے بعد وہ اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کر لیتی اور مسلمانوں کی ہمدرد و ہمنوا بن کر ان کی ترقی وخوشحالی کے مواقع فراہم کرنے لگتی مسلمانوں کا ذکر کیا کانگریس نے تو اپنے محسنوں سے بھی وفا نہ کی۔ تقسیم ہند کے وقت سکھوں نے کانگریس کا بھرپور ساتھ دیا لیکن جب اپنا مطلب نکل گیا تو انہیں ایسا مایوس کیا کہ سکھوں نے ''خالصتان'' کا مطالبہ کر دیا اور اس کیلئے سینکڑوں جانیں قربان کر دیں۔ سکھ ہندوستان کی ایک منظم آسودہ حال اور طاقتور اقلیت ہے۔ ہندوستان کے صوبہ پنجاب میں ان کی اکثریت اور حکومت ہے۔ ہندوستانی افواج میں ان کی نمائندگی تقریباً دس فیصد ہے۔ اس کے باوجود کانگریس سے وہ اپنے حقوق حاصل نہ کر سکے، کانگریس نے سکھوں کے ساتھ جو ناانصافیاں کی ہیں وہ تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ جب کانگریس اپنے دست راست سکھوں کے ساتھ عدل وانصاف نہ کر سکی تو وہ بھلا مسلمانوں کے ساتھ کیا انصاف کرتی۔

ان تمام حقائق کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ پاکستان برصغیر ہند کے مسلمانوں کی بقا اور ان کے روشن مستقبل کیلئے انتہائی ضروری تھا۔ ایسی صورت میں یہ اعتراض کہ اگر پاکستان وجود میں نہ آتا تو برصغیر ہند کے مسلمان اجتماعی طور پر زیادہ طاقتور ہوتے۔ حقیقت سے صریحی روگردانی اور جذبہ حب الوطنی سے عاری ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔



سیّد کلبِ ارتضیٰ نقوی